ہاتھی کے دانت

پہلی بار

مقام، نام اور ادارے
فرضی تصور کئے جائیں۔
مصنف اور ناشر پر
کسی قسم کی ذمہ داری
عائد نہیں ہوگی۔

قیمت:۔ تین روپے

ناشر چرنجیت لال
برائے
دیپک پبلشرز
جالندھر

ہاتھی کے دانت

طنزیہ اور مزاحیہ مضامین

ابناش چندر سود

دیپک پبلشرز جالندھر

ناشر چرنجیت لال برائے
دیپک پبلشرز نے موہن
پریس جالندھر سے
چھپوایا۔

انتساب

اُن تمام ادب نوازوں کے نام

جو کتابوں کو کرایہ پر لے کر، مانگ کر یا چُرا کر ادیبوں کی سرپرستی فرماتے ہیں!

ہاتھی کے دانت

فہرست مضامین

دیباچہ عرف پیش لفظ

دیباچہ لکھنے سے پہلے میں اسے بہت آسان کام سمجھتا تھا لیکن حال ہی میں مجھ پر یہ بھید کھلا ہے کہ یہ کام اتنا ہی مشکل ہے جتنا کہ سنجیونی بوٹی کو ڈھونڈنا! میں پورے یقین کے ساتھ یہ پیشگوئی کر سکتا ہوں کہ جو شخص کسی کتاب کا دیباچہ نہیں لکھ سکتا وہ ایک کامیاب نائی۔ جولاہا یا مداری وغیرہ تو بن سکتا ہے لیکن ایک ادیب ہرگز نہیں۔ اب مجھ پر اُن ادیبوں کے ڈھول کا پول کھُل گیا ہے جو ترقی پسندی یا ایسی قسم کے دوسرے خوبصورت بہانوں کی آڑ لے کر بغیر پیش لفظ کے ہی کتاب شایع کر دیتے ہیں۔ شاید آپ کو یقین نہ آئے لیکن یہ حقیقت ہے کہ جتنا عرصہ مجھے اس کتاب کو لکھنے میں لگا ہے اس سے تقریباً ڈیوڑھا وقت اس کے دیباچہ کو لکھنے میں صرف ہوا ہے۔ اس دیباچہ کو لکھنے سے پیشتر میں نے دُنیا کی کم از کم اڑھائی ہزار بہترین کتابوں کے پیش لفظ پڑھے ہیں اُن میں سے چند ایک تو اتنے اچھے تھے کہ اگر ان کے فاضل مصنف باقی کتاب نہ بھی لکھتے تو آج تک ادبی دُنیا میں ان کا نام بڑے احترام سے لیا جاتا۔ لیکن اُن میں کچھ اتنے

مہمل اور پھسپھسے لکھے کہ ان کا مقابلہ باآسانی چھٹی یا ساتویں جماعت کے کسی طالب علم کے لکھے ہوئے جواب مضمون سے کیا جا سکتا تھا ۔ بہر حال دیباچہ لکھنا ہے ایک دلچسپ چیز۔ میں اپنے طویل اور قیمتی تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ اگر آپ دیباچہ لکھنے کا کام خود کرتے ہیں تو پڑھنے والوں پہ بلا شرکت غیرے اپنی قابلیت کا سکہ جما سکتے ہیں ۔ وہ اس طرح کہ کہاوتوں (Quotations) کی کوئی کتاب اٹھا کر دس مشہور مصنفین کے سنہری خیالات کا حوالہ اپنے دیباچہ میں ضرور دیجئے چاہے وہ موقعہ کے مطابق نہ بھی ہوں کیونکہ دنیا میں عام طور پر وہی چیزیں بلند پایہ خیال کی جاتی ہیں جنہیں عام لوگ نہ سمجھ سکیں۔ اس کے بعد اپنی توفیق کے مطابق کچھ مشہور علم کتابوں اور ادیبوں کا ذکر بھی کر دیجئے۔ ان کی کتابوں سے کچھ اقتباسات بھی جا بجا سطروں میں ٹھونس دیجئے لیجئے دیباچہ حاضر ہے عام لوگ خصوصاً اور خاص لوگ عموماً آپ کی قابلیت کے قائل ہو جائیں گے۔ اگر آپ خود کو دیباچہ لکھنے کے نا قابل سمجھ کر یہ کام اپنے کسی دوست یا ہم پیشہ سے کروا لیتے ہیں تو معاملہ اور بھی آسان ہو جاتا ہے وہ آئین یا ضابطہ فوجداری کی کسی بھی دفعہ کی زد میں آئے بغیر آپ کی تعریفوں کے پل باندھ سکتا ہے ۔ اور یہ پل اتنے شاندار ہو سکتے ہیں کہ اگر ہوڑہ برج اور دنیا کے دوسرے مشہور پل آپ کی تعریفوں کے ان عظیم الشان پلوں کو دیکھیں تو مارے شرم کے اُن کا دل چلو بھر پانی میں تو نہیں البتہ اپنے نیچے بہتے ہوئے اتھاہ پانی میں گر کر ڈوب جانے کو ضرور چاہے گا۔

مروجہ چال کے مطابق تو مجھے بھی طنز و مزاح کے ارتقا اور جدید ایک مشہور طنز نگاروں اور مزاح نویسوں کے ارشادات عالیہ پر سیر حاصل تبصرہ

کرنا چاہیئے تھا۔ اس کے بعد آپ کو مزید مرعوب کرنے کے لئے بھاری بھرکم الفاظ میں اسی موضوع پر اپنے ذاتی خیالات اور لیاقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک لمبا چوڑا مضمون بعنوان "طنز و مزاح ... میری نظر میں" وغیرہ لکھنا چاہیئے تھا لیکن میں یہ سب کچھ نہیں کروں گا کیونکہ مجھے چند ایک خفیہ ذرائع سے معلوم ہو گیا ہے کہ آج کل کے قارئین پچھلے وقتوں کے قارئین کی نسبت زیادہ سمجھدار ہو گئے ہیں۔ وہ اتنے کند ذہن نہیں رہے کہ بھلے اور بُرے کی پہچان نہ کر سکیں۔ اس لئے میں اس کتاب کی پرکھ کی ذمہ داری کا بوجھ پوری شدت سے آپ کے مضبوط کندھوں پر پھینکتا ہوں۔ آپکی قیمتی رائے میری ادبی شاہراہ کے تاریک موڑوں پر سرخ لائٹ کا کام دے گی۔

کوئی بھی دیباچہ اُسی وقت تک مکمل نہیں سمجھا جاتا جب تک کہ اُس کے آخر میں اپنے اُن دوستوں۔ کرمفرماؤں اور ناشر صاحبان کا شکریہ نہ ادا کیا گیا ہو جنہوں نے آپ کی کتاب چھپنے کے دوران کسی بھی مرحلہ پر آپ کے سر پر اپنا شفقت بھرا ہاتھ رکھا ہو۔ لہٰذا میں بھی شری رام دلو جی ڈاکٹر ون گوپال مہتہ۔ جناب مہر گیرا۔ پریم کمار نظر اور شری جسبیت جی اور کنور سین حسرت کا سر سے لیکر پاؤں تک ممنون ہوں۔ اگر یہ احباب مختلف طریقوں سے میری امداد نہ کرتے تو شاید یہ کتاب آپ کے ہاتھوں میں پہنچنے کی بجائے قلمی نسخے کی شکل میں ہی میرے ہاتھوں میں محفوظ رہ جاتی اور میں اس جہانِ فانی سے کوچ کرتے وقت دوسرے ساز و سامان کی طرح ہمیشہ اسے بھی اپنے پسماندگان کی امانت میں دے جاتا۔

میں سٹیفن لی کاک، شفیق الرحمان اور کنہیا لال کپور جیسے بلند پایہ ادبا کا بھی تہہ دل سے مشکور ہوں۔ انہی اصحاب کی بخیہ ادھیڑ تحریروں سے متاثر ہو کر ہی میرے تخیل کے گھوڑے کو اتنے زور سے چابک لگے کہ وہ لنگڑا کر چلنے کی بجائے سرپٹ دوڑنے لگ پڑا۔ اگر آپ کہیں اس گھوڑے کو ہانپتا ہوا یا ہنہناتا ہوا دیکھیں تو اس میں مندرجہ بالا شہسواروں کا کوئی قصور نہ پاکر اپنے اس ناچیز بندہ کو یاد کر لیجئے گا۔ شکریہ۔

"دلبر نواس"

۱۷ جنوری سنہ ۱۹۶۲ء "رام نواس" چھتہ بازار

ہوشیارپور — انباش حنیف مسعود

اُف میرے دوست

ایک وقت تھا صاحب میں ان لوگوں پر رشک کیا کرتا تھا۔ جن کے
زیادہ سے زیادہ دوست ہوتے تھے۔ لیکن اب حال یہ ہے کہ میں کسی شخص
کی بدنصیبی کا اندازہ اس کے دوستوں کی تعداد سے ہی لگا لیتا ہوں۔ پہلے
میں دوستوں کی صحبت کے بغیر ایک پل بھی نہیں کاٹ سکتا تھا۔ مگر اب
حالات اتنے بدل گئے ہیں۔ کہ مجھے اُن کا خیال ہی کاٹنے کو دوڑتا ہے۔ اِن سطور
کو پڑھ کر شاید آپ کے دل میں یہ خیال آگیا ہو کہ صاحب مضمون بھی کیسا چُغد
ہے جو دوستوں جیسی نعمت کے بارے میں ایسے ایسے لغو جملے تحریر کر رہا ہے
دیکھئے بندہ پرور۔ میرے اخلاق کا اندازہ لگانے میں اتنی جلد بازی اختیار
نہ کیجئے۔ دوستوں کے ہاتھوں جو میری دُرگت بنی ہے پہلے اس کی روداد سُن
لیجئے۔ اور بعد میں بڑے شوق سے میرے اخلاق کے متعلق فتوے
صادر کر دیجئے گا۔ ہاں تو سنئے۔ دوستوں سے میری اس بیزاری کی وجہ

یہ ہے۔ کہ انہوں نے مجھے اچھا خاصہ مفلس بنا دیا ہے۔ سب کچھ مانگ کر لے جاتے ہیں۔ بعض اوقات تو جو چیزیں میں خود کسی سے مانگ کر لاتا ہوں وہ انہیں بھی مانگ کر لے جاتے ہیں۔ کوئی آتا ہے۔ تو "دیوانِ غالب" اٹھا کر لے جاتا ہے۔ کوئی اور آتا ہے تو "پانچ سالہ پلان" کو بغل میں دبا کر راستہ ناپتا ہوا نظر آتا ہے۔ "جنت گم گشتہ" کا پتہ ہی نہیں کہ کس نے اغوا کر لی ہے۔ گرمیوں میں ایک دوست دھوپ کا چشمہ مانگ کر لے گئے تھے سردیاں آگئی ہیں لیکن چشمہ ابھی تک واپس نہیں آیا۔ کہنے کو تو میرے پاس ایک سائیکل بھی ہے۔ لیکن دفتر مجھے پیدل ہی جانا پڑتا ہے۔ بیچاری سائیکل اگر ایک دن ایک دوست کے نیچے ہوتی ہے تو دوسرے دن کسی اور کے ہاں۔ جتنا عرصہ وہ ٹھیک طرح سے چلتی رہتی ہے تب تک وہ میرے دوستوں کے پاس رہتی ہے۔ مگر جب کبھی پنکچر لگوانا ہو یا کوئی اور کسی قسم کی مرمت کروانی ہو تو میرے پاس پہنچ جاتی ہے اس لئے بعض اوقات تو میں بھول ہی جاتا ہوں کہ میرے پاس کوئی ذاتی سائیکل بھی ہے۔ قصہ مختصر میری کتابیں۔ کپڑے۔ گھڑی۔ پین۔ کیمرہ اور ٹیبل لیمپ وغیرہ سب دوستوں کے گھر پر ہی ہیں۔ اس لئے جب کبھی میں اُن کے گھر جاتا ہوں۔ تو مجھے ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے کہ میں اپنے ہی گھر میں بیٹھا ہوا ہوں۔ چیزیں مانگتے وقت وہ کچھ بھی نہیں سوچتے۔ لہذا ایک دن میرے ایک محترم دوست میری نظر کی عینک ہی مانگ کر لے گئے۔ کیونکہ انہیں عینک لگا کر کسی ڈرامے میں پارٹ ادا کرنا تھا۔

اس وقت جبکہ میرے پاس اپنے دوستوں کو دینے کے لئے کچھ باقی نہیں رہا ہے مجھے شک ہی نہیں بلکہ پختہ یقین ہو گیا ہے کہ میری شادی کے بعد وہ میرے سسرال سے آئی ہوئی سب چیزیں بھی مانگ کر لے جائیں گے!

میرے مہربان دوست صرف چیزیں مانگنے پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ کئی اور طریقوں سے بھی انہوں نے میرا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ وقت بے وقت آ دھمکتے ہیں۔ اور کسی بھی طریقے سے (چاہے وہ کتنا ہی غیر مہذب کیوں نہ ہو) اس وقت تک واپس نہیں جاتے جب تک کہ خود ان کی طبیعت نہ چاہے۔ میری طبیعت کے خلاف وہ بدستور اپنی باتیں سنانے چلے جائیں گے۔ اپنی بیزاری کا اظہار کرنے کے لئے میں بہتیری جمائیاں اور انگڑائیاں لیتا ہوں لیکن وہ کچھ ایسی چکنی مٹی کے بنے ہوئے ہیں کہ میری اس اکتاہٹ کا ان پر رتی بھر اثر نہیں ہوتا۔ ایک شاعر قسم کے حضرت آتے ہیں۔ اور آتے ہی اپنے نئے نئے تحریر کردہ اشعار کی گولہ باری شروع کر دیتے ہیں۔ جب تک اچھی طرح "بور" نہ کر لیں ہرگز ہرگز پیچھا نہیں چھوڑتے۔ اگر ان کی مرثیہ نما غزل کے اشعار کے ایک مصرعے کا وزن ڈیڑھ چھٹانک ہو تو دوسرے کا سیروں تک پہنچ جاتا ہے اور اس پر طرہ یہ کہ ایسے حضرت اپنے آپ کو غزل کا بادشاہ کہتے میں ذرہ بھر شرم محسوس نہیں کرتے۔ اکثر اپنا مقابلہ شکیل بدایونی سے کرتے رہتے ہیں۔

ایک اور صاحب جب بھی ملتے ہیں۔ فوراً اپنی کسی نہ کسی بیماری کا تذکرہ شروع کر دیتے ہیں۔ پہلے پہل وہ ان ڈاکٹروں، حکیموں اور ویدوں کے نام گنواتے ہیں جن کا علاج وہ کرا چکے ہیں۔ یا کروا رہے ہیں۔ اس کے بعد وہ اس رقم کا حساب لگا کر سناتے ہیں جو کہ وہ دوائیوں، انجکشنوں، ٹوٹکوں، الکحل وغیرہ پر خرچ کر چکے ہیں۔ جب ان چیزوں کا ذکر خیر ختم ہو جاتا ہے تو وہ بیماری کی مختلف حالتوں کا مفصل اور سلسلے وار بیان شروع کر دیتے ہیں اور اس وقت تک ختم نہیں کرتے۔ جب تک کہ مجھ سے اپنی حالتِ زار پر خاطر خواہ رنج و غم، افسوس اور ہمدردی کا مکمل اظہار نہ کروا لیں۔ ان کی شخصیت کا ایک اور دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ انہیں ہندوستان میں بنی ہوئی کوئی چیز پسند نہیں آتی۔ غیر ملکوں خاص کر انگلستان میں بنی ہوئی چیزوں پر جان چھڑکتے ہیں۔ انگریزوں کے زبردست مداح ہیں اور بات بات میں ان کا حوالہ دے دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر دو چار فقرے ایسے پیش کرتا ہوں جو کہ ان کا تکیہ کلام ہیں۔ "انگلینڈ کی طرف دیکھو، وہاں کیا ہو رہا ہے"۔ "کم از کم انگلینڈ میں ایسا نہیں ہوتا کوئی انگریز ایسی حرکت نہیں کر سکتا"۔ "اجی کیا کہنے انگریز کے دماغ کے"...... اور میں ان کے منہ پر ہی کہہ دیتا ہوں۔ "انگریز تو چلے گئے لیکن تمہاری صورت میں اپنی یاد چھوڑ گئے۔ ہندوستان چھوڑتے وقت وہ بیچارے ذرا جلدی میں تھے ورنہ وہ تمہیں ضرور اپنے ساتھ لے گئے ہوتے!

ایک دوست ایسے بھی ہیں کہ جب کبھی وہ مجھ سے ملنے آتے ہیں تو میں سمجھ لیتا ہوں کہ اب خانہ تلاشی ہونے والی ہے۔ "الف" سے لیکر "یے" تک

وہ کمرے کی تمام چھوٹی بڑی چیزوں کو اٹھا اٹھا کر ان کا ایک جاسوس کی طرح بغور معائنہ کرتے رہتے ہیں جس دن بھی یہ صاحب آتے ہیں اس دن شیشے یا چینی کی کوئی نہ کوئی چیز لازمی طور پر ان کے ہاتھوں شہید ہو کر مجھے ہمیشہ کے لئے داغِ مفارقت دے جاتی ہے۔

ایک اور صاحب جب کبھی مجھ سے ہاتھ ملا کر واپس جانے لگتے ہیں تو موسم کے مطابق ضرور کسی نہ کسی چیز کی فرمائش کر دیتے ہیں۔ اگر گھر سے باہر دھوپ تیز ہو تو چھتری کی .... بارش ہو تو برساتی کی۔ ۔ .....اور اگر موسم معتدل ہو تو ریشمی مفلر ہی گلے کے ارد گرد لپیٹ کر چلتے بنیں گے۔ شاید انہوں نے اس مفلر کو جاڑے کا نعم البدل سمجھ رکھا ہے جو گرمیوں میں ٹھنڈک اور سردیوں میں گرمی پہنچاتا ہے۔

جب کسی دوست نے سگرٹ پینے ہوتے ۔ تو وہ کسی پان سگریٹ والے کی دوکان کی بجائے سیدھا میرے گھر کا راستہ اختیار کر لیتا ہے اور کمرے میں خود کو صوفے میں دھنسانے کے بعد بڑی بے تکلفی سے سگریٹ کو ڈبے میں سے نکال کر سلگاتے ہوئے نہایت ہی اطمینان سے میز پر پاؤں جما کر کش پر کش لگانا شروع کر دیتا ہے۔ گھنٹہ آدھ گھنٹہ فضول گپوں میں ضائع کر کے جب دو تین سگریٹیں پی چکتا ہے تو مزید تین چار جیب میں ٹھونس کر پھر کبھی آنے کی دھمکی دیتا ہوا ٹہلتا ٹہلتا تشریف لے جاتا ہے۔

کچھ دن ہوئے میرے چند بے تکلف دوست کمرے میں گھس آئے تھوڑی دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ اور اس کے بعد پُر تکلف چائے کا دور چلا۔ اتنے میں میرے ایک دوست مسٹر پال نے کہا۔ "ارے یار۔ وہ نئے ریکارڈ

دوست واڑ جو تم پرسوں خرید کر لائے تھے۔ ان کی یہ فرمائش پوری کرنی پڑی۔ جب وہ ایک ایک ریکارڈ کو چار چار مرتبہ سن چکے تو ایک لمبی سانس لے کر بولے "واہ کتنے اچھے ریکارڈ ہیں۔ آج تو میں انہیں ساتھ ہی لے جاؤں گا۔ ایک دو دن سن کر واپس کر دوں گا"۔ میں ابھی ریکارڈ دینے یا نہ دینے کی بابت ہی سوچ رہا تھا کہ وہ پھر بولے "ہاں خوب یاد آیا۔ گراموفون بھی ساتھ ہی لئے جاؤں گا۔ کیونکہ ہمارا گراموفون میرے چھوٹے بھائی کے ہاتھوں سے گر کر ناقابل استعمال ہو چکا ہے۔ سوئیوں کی ڈبی بھی ساتھ ہی رکھ دینا"۔ لیجئے میں تو ریکارڈوں کی بابت ہی سوچ رہا تھا انہوں نے گراموفون اور سوئیوں کی فرمائش کر دی۔ کیا کرتا مجبور ہو کر یہ سب چیزیں دینی ہی پڑیں۔ جب اس دوست کی فرمائش پوری ہو گئی تو باقی معزز دوستوں مسٹر مسٹر سندر اور مسٹر پال نے سوچا کہ وہ بھی پال سے پیچھے کیوں رہیں۔ لہذا جاتی دفعہ ان میں سے ایک میز پر پڑا ہوا رسالہ "آج کل" لے گیا۔ دوسرے نے دستانے اٹھا کر پہن لئے .... اور تیسرے کو جب لے جانے کو کچھ اور نہ سوجھا تو وہ پرانے اخباروں کی چار پانچ سیر ردی ہی اٹھا کر لے گیا لیکن میں نے پھر بھی خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔ کہ کہیں وہ مجھے ہی اٹھا کر نہیں لے گئے!

لیکن میں اس حادثے کے بعد بہت ہی عقلمند بن گیا۔ میں نے اپنے کمرے کی سب چیزیں اٹھوا کر ایک دوسرے کمرے میں پہنچا دیں۔ اب میرے کمرے میں صرف ایک صوفہ سیٹ، چار کرسیاں۔ ایک میز اور ایک دری رہ گئی تھی۔ میں بہت خوش تھا۔ کہ اب میرے کمرے میں دوستوں کے مانگنے

کے لئے کوئی چیز نہ رہ گئی تھی۔ اب میں آرام سے بلا خوف و خطر اپنے کمرے میں بیٹھتا جس چیز کی ضرورت ہوتی دوسرے کمرے سے لے آتا اور اسے استعمال کرنے کے بعد پھر وہاں ہی رکھ آتا۔ مگر افسوس میری بدقسمتی کے دن ابھی ختم نہیں ہوئے تھے۔ اچانک ہی ایک دن میرے عزیز دوست کرشن کمار صاحب تین چار مزدوروں کے ساتھ تشریف لائے اور فرمانے لگے "جلدی سے یہ صوفہ سیٹ، کرسیاں، میز اور دری ان لوگوں کے سر پر اٹھا دو کیونکہ اگلے ہفتے میری بہن کی شادی ہے اور ہمیں ان چیزوں کی سخت ضرورت ہے"۔ میں ابھی اس ناگہانی مصیبت کی بابت سوچ ہی رہا تھا کہ مزدوروں نے جھٹ پٹ یہ چیزیں اپنے سروں پر اٹھائیں اور میرے عزیز دوست کے ہمراہ چلتے بنے۔ میں اپنا سر پکڑ کر فرش پر بیٹھ گیا۔ اور اپنے دوستوں کی جان کو دعائیں دینے لگا۔ اب میرے کمرے میں فرش کی اینٹیں باقی رہ گئی ہیں مگر ان کا بھی کوئی بھروسہ نہیں۔ پتہ نہیں کب کوئی ضرورت مند دوست آئے اور انہیں بھی اکھاڑ کر چلتا بنے۔

دیکھ لی آپ نے میرے دوستوں کی کرم فرمائیاں۔ انہوں نے تو میرا دیوالہ ہی نکلوا دیا ہے۔ اس لئے اب ان سے ملنا تو درکنار مجھے ان کے سائے سے بھی ڈر لگتا ہے کم بخت خوابوں میں بھی پیچھا نہیں چھوڑتے۔ جب کبھی نظر آ جاتے ہیں کسی نہ کسی چیز کی فرمائش کرتے ہیں ہمارے دشمن تو ہمیں گھر سے باہر ہی نقصان پہنچاتے ہیں لیکن دوست صاحبان دشمنوں سے بھی خطرناک ہیں کیونکہ یہ گھر کے اندر بھی سکھ کا سانس نہیں لینے دیتے۔ ان سب حالات کو دیکھتے ہوئے اب میں کیوں نہ پکار اٹھوں۔ خدا دوستوں سے سب کو بچائے۔

جب خدا ہندوستان میں آیا

ایک دن بیٹھے بٹھائے نہ جانے خدا کے دل میں کیا خیال آیا کہ وہ ایک انسان کے بھیس میں ہندوستان کی سر زمین پر اُتر آیا۔ سب سے پہلے وہ ایک مندر میں گیا۔ شام کا وقت تھا بھگوان کے بھگت شری لکشمی نارائن جی کی آرتی اُتار رہے تھے۔ جب آرتی ختم ہوئی تو خدا لکشمی نارائن کی مورتی کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا اور مزے سے پاس رکھا ہوا بھوگ چکھنے لگا۔ خدا کی اس بدتمیزی پر بھگتوں کو غصہ آ گیا۔ پجاری جی کڑک کر بولے "یہ کیا بیہودگی ہے۔ کون ہو تم۔ یہاں کیوں گھسے ہو؟" خدا نے بڑی نرمی اور پریم سے کہا "پہچانا نہیں آپ نے مجھے۔ پجاری جی، میں بھگوان ہوں۔ آپکا پرماتما جس کی آپ ابھی ابھی آرتی اُتار رہے تھے" یہ سنتے ہی پجاری جی نے کچھ اس طرح بُرا سا منہ بنایا جیسے انہوں نے ابھی ابھی کوئی کڑوی اور کسیلی دوائی پی ہو۔ چند لمحوں بعد وہ طنزیہ انداز میں بولے "۔ اچھا تو آپ بھگوان ہیں۔ ہونہہ۔ شکل دیکھی ہے اپنی ذرا آئینے میں" پھر خدا کو بازو سے کھینچ

کر گھسیٹتے ہوئے کہنے لگے "چلیں نکل یہاں سے بہروپیا کہیں کا۔ سالے نے سارا
بھوگ خراب کر کے رکھ دیا بھگوان کا۔ اگر مندر میں کھڑے ہو تو بچ گئے ہو ورنہ مار مار کر
اتنا برا حال کرتے کہ تم اپنے آپ کو پرماتما تو کیا چھوٹا موٹا دیوی دیوتا بھی نہ کہتے" یہ
اس کے بعد پجاری جی اور بھگت لوگ خدا کو گھسیٹ کر مندر کے باہر لے گئے اور اسے
دھکا مار کر سیڑھیوں سے نیچے دھکیل دیا تھا۔ اس کی کہنیاں اور گھٹنے چھل گئے۔ اسے
بہت غصہ آیا۔ اس کے دل میں آ رہا تھا۔ اسی وقت ان لوگوں کو ان کی گستاخی کی سزا
دے دی جائے مگر وہ یہ سوچ کر چپ ہو رہا کہ وہ تو انسان کے بھیس میں آیا ہوا
ہے تاکہ لوگوں کے بیچ گھوم پھر کر ان کی صحیح حالت کا جائزہ لے سکے۔

اس کے بعد خدا جامعہ مسجد واقع پرانی دہلی میں آیا۔ یہاں اللہ کے
بندے ابھی ابھی شام کی نماز پڑھ کر فارغ ہوئے تھے۔ خدا ان کے درمیان
گیا اور زور سے بولا "فرزندان اسلام تمہیں یہ جان کر خوشی ہوگی کہ آج تمہارا خدا
۔۔۔۔۔۔ تمہارا اللہ بہ نفس نفیس تمہارے درمیان کھڑا ہے۔ میں دنیا میں آج
اس لئے آیا ہوں تاکہ اپنے بندوں کی تکلیفوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکوں میں نے
انسان کا بھیس اس لئے بنایا ہے تاکہ تمام دکھوں اور تکلیفوں کو تمہاری
طرح محسوس کر سکوں۔ دوسرے تم میں اتنی طاقت بھی نہیں ہے کہ میرے نور کے
دید کی تاب لا سکو کیونکہ یہ تو تمہیں بخوبی معلوم ہی ہے کہ حضرت موسیٰ کے ساتھ
کوہ طور پر کیا گزری تھی۔ اس لئے اے مسلمانو! مجھے بتاؤ کہ تمہاری تکلیفیں کیا کیا ہیں؟
یہ سنتے ہی لوگوں کے ہجوم میں کھسر پھسر ہونے لگی۔ کچھ لوگ قہقہے لگانے لگے۔ ایک
صاحب اپنے ساتھیوں سے فرمانے لگے "یہ بھی صاحب آ گئے تو خلیفے

ہی پیدا ہوتے تھے جیسے کہ خلیفہ قادیانی مگر آج خود حضرت خدا بہ نفس نفیس
اس دنیا میں ٹپک پڑے ہیں۔" یہ سن کر ان صاحب کے ساتھیوں نے ایک فلک
شگاف قہقہہ لگایا اور خدا کی طرف دیکھنے لگے۔ خدا کو دیکھنے کے بعد پھر
قہقہہ لگا۔ اسی طرح خدا کو کئی بار دیکھا گیا اور قہقہے لگائے گئے۔ ایک جوشیلے
مولوی صاحب فرمانے لگے "باہر نکالو کافر کو۔ یہ خدا کے گھر کو ناپاک کرنے
آیا ہے۔ خبیث کہیں کا ضرور اسے ہندو بھائیوں نے بھیجا ہوگا۔" یہاں بھی
خدا کا وہی حشر ہوا۔ جو برلا مندر میں ہوا تھا۔

جامع مسجد سے بے آبرو ہو کر نکلنے کے بعد خدا چاندنی چوک کے
گردوارہ میں جا پہنچا۔ وہاں اس نے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "میرے
پیارے اور بہادر بچو۔ میں تمہارا واہگورو ہوں۔ تمہارا کرتار ہوں۔ اے
گورو کے پیارو تم مجھے اپنی تکلیفیں بتاؤ۔ میں انہیں دور کروں گا۔" یہ سنتے
ہی ایک سردار صاحب دوسرے سردار صاحب سے فرمانے لگے۔ "لئو۔ سردار جی
سنیا۔ کی کہندا اے۔" (لو۔ سردار جی سنا۔ کیا کہتا ہے؟)۔ دوسرے سردار جی
بولے "آہو جی سنیا اے۔ سانوں تاں اے کوئی پاکھنڈی لگدا اے۔ ہووے
نہ ہووے اے ضرور مسلماناں دا جاسوس اے۔" (جی ہاں۔ سنا ہے مجھے
تو یہ کوئی پاکھنڈی معلوم پڑتا ہے۔ ہو نہ ہو یہ ضرور مسلمانوں کا جاسوس ہے)
ان دونوں کے پاس ہی کھڑے ہوئے ایک تیسرے سردار صاحب نے ہمدردی کے
لہجے میں کہا "مینوں تاں بیچارا کوئی دکھی لگدا اے۔ شاید جائیداد یا دشمنی دا دکھ
دے غم وچ پاگل ہو گیا اے۔" (مجھے تو بیچارہ کوئی دکھی معلوم پڑتا ہے۔

شاید جاٹ سیدا یا رشتے داروں کے غم میں پاگل ہو گیا ہے۔ غرضیکہ خدا کو
یہاں سے بھی نکال دیا گیا۔ مگر خدا کو یہاں دھکے نہیں ملے بلکہ اُسے کڑاہ
سا حلوے کا پرشاد دے کر بہ عزتی سے گوردوارہ کے باہر چھوڑ دیا گیا۔

وہ کچھ سوچتا سوچتا لال قلعے تک جا پہنچا۔ رات ہو چکی تھی لال قلعے کے
سامنے والے میدان میں گھاس پر بیٹھ کر وہ پھر کچھ سوچنے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا
کہ لوگوں کو کس طرح یقین دلایا جائے کہ واقعی وہ خدا ہے۔ آخر اُسے ایک
ترکیب سوجھ ہی گئی۔ اس نے منہ میں کچھ منتر پڑھا۔ دوسرے ہی لمحے اس
ہاتھ میں ایک بیگ تھا جس میں سو سو کے بیشمار نوٹ پڑے ہوئے
تھے۔ خدا نے فوراً ایک ٹیکسی لی اور اشوکا ہوٹل میں ایک کمرہ ریزرو کروا لینے
کے بعد روزانہ اردو اخبار "تیج" کے دفتر واقع یرن مبس روڈ پر جا پہنچا
ایڈورٹائزنگ منیجر (advertising manager) کے کمرے میں
پہنچ کر اس نے ایک اشتہار کا مضمون تیار کیا اور اسے منیجر صاحب کے سامنے
پیش کر کے چھپوائی کی اُجرت پوچھی اور ساتھ ہی یہ شرط رکھی کہ یہ اشتہار
اخبار کے پہلے صفحے پر چھاپا جائے اور اس صفحے پر دیگر کوئی خبر یا اشتہار وغیرہ
نہ ہو۔ اشتہار کا مضمون پڑھ کر ایڈورٹائزنگ منیجر صاحب چونک اُٹھے۔ مضمون
یہ تھا۔

دہلی میں خدا کی آمد

میرے پیارے بچو۔ میں یعنی خدا العظیم گاڈ یا داتا گھر رعد
جو کچھ بھی آپ کی مرضی ہو سمجھ لیں، آپ کی اس دنیا میں ایک انسان کے روپ میں

آچکا ہوں ۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کی طرح ایک عام انسان بن کر آپ کے دکھوں اور تکلیفوں کو آپ ہی کی طرح محسوس کروں اور اُن کو دُور کرنے کی کوشش کروں اسی سلسلے میں میں براہ راست ۔ یہ جامع مسجد اور چاندنی چوک کے گرد و نواح سے بھی گیا ۔ مگر کسی بھی شخص نے میرا اعتبار نہیں کیا ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے دنیا سے زبان کا اعتبار بالکل اٹھ گیا ہے ۔ لہٰذا میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں لوگوں کو اپنے خدا ہونے کا یقین دلانے کے لئے کوئی معجزہ کر کے دکھاؤں ۔ اس لئے آپ سب کو اس اشتہار کے ذریعہ مطلع کیا جاتا ہے کہ میں پرسوں یعنی منگل کی دس تاریخ کو دوپہر کے عین بارہ بجے سورج کو پانچ منٹ کے لئے غروب کر دونگا اور آپ کو دن کو تارے دکھا دونگا ۔ امید ہے اس طرح آپ کو مجھ پر یقین آجائے گا ۔

میں ہوں آپکا خیر خواہ

"خدا"

اشتہار کا مضمون پڑھنے کے بعد منیجر صاحب نے خدا کو ایسی نظروں سے دیکھا گویا کہہ رہے ہوں "اجی حضرت آپکا دماغ تو صحیح ہے نا؟" خدا نے منیجر صاحب کا مطلب سمجھ لیا اور ہنس کر بولا "میرا دماغ بالکل صحیح ہے ۔ آپ ایک فیصدی بھی فکر نہ کریں" منیجر صاحب ذرا کھسیانہ ہو کر بولے "نہیں میرا یہ مطلب تو ہرگز نہیں ہے ہمیں تو اشتہار چھاپنے کی اُجرت لینی ہے چاہے آپ کیسا ہی مضمون کیوں نہ لے آئیں ۔ ہاں تو پہلے صفحہ پر صرف آپکا اشتہار ہی چھپ جائے گا لیکن پانچ ہزار روپے

لگیں گے"۔ "اجی مینیجر صاحب آپ روپیوں کی بات چھوڑ دیئے۔ پانچ ہزار چھوڑ کر میں دس ہزار آپ کو دونگا۔" یہ کہکر خدا اسنے واقعی بیگ سے دس ہزار نوٹوں کا ایک بنڈل نکال کر مینیجر صاحب کے میز پر رکھتے ہوئے کہا "لیجئے آپ دس ہزار ہی لیجیے"۔ مینیجر صاحب ہکے بکے رہ گئے۔ تھوڑی دیر بعد انہوں نے کہا "یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں تو صرف پانچ ہزار ہی لونگا"۔ "میں تو دس ہزار ہی دونگا"۔ خدا اسنے اصرار کیا۔ تھوڑی دیر تک یہ پانچ ہزار اور دس ہزار کا تکلف چلتا رہا۔ آخر مینیجر صاحب کو ایک ترکیب سوجھ ہی گئی۔ انہوں نے خدا اسے کہا "اچھا صاحب۔ دس ہزار ہی لے لیتے ہیں آپ کا اشتہار کل دوبارہ شائع کر دیا جائے گا"۔ خدا مینیجر صاحب کی اس عقلمندی کی داد دیئے بنا نہ رہ سکا۔ مینیجر صاحب نے کس صفائی سے اپنی اور خدا العینی دونوں کی بات رکھ لی تھی۔

یہاں سے فارغ ہونے کے بعد خدا اپنے آپ ہندوستان ٹائمز، ٹائمز آف انڈیا، و دیگر اخبارات کے دفاتر میں گیا اور انہیں بھی اپنا اشتہار دو دفعہ چھپنے کے لئے دے دیا۔

دوسرے دن صبح جب یہ اخبارات لوگوں کے ہاتھوں میں گئے تو سارے ہندوستان میں اس اشتہار کو دلچسپی اور حیرانی سے پڑھا گیا لوگ حیران ہو رہے تھے کہ آخر ماجرا کیا ہے۔ وہ اشتہار پڑھ رہے تھے اور حیران ہو رہے تھے۔ حیران ہو کر پھر پڑھتے اور پڑھ کر پھر حیران ہو رہے تھے۔ جگہ جگہ اسی عجیب و غریب اشتہار کا

ذکر ہو رہا تھا۔ یوں یوں دن چڑھتا گیا۔ توں توں اس اشتہار کا ذکر بھی بڑھتا گیا۔ گلیوں اور بازاروں میں، دوکانوں اور دفتروں میں، ہوٹلوں اور کلبوں میں اسی اشتہار پر رائے زنی ہوتی رہی۔ ایک صاحب فرما رہے تھے "میرے خیال میں تو یہ کسی سر پھرے امیر آدمی کا کارنامہ ہے جس نے پاگل پن کے جوش میں آ کر اخباروں میں ایسا اشتہار دے دیا۔ اخبار والوں نے تو اسے چھاپنا ہی تھا کیونکہ انہیں تو روپے سے غرض ہے اور روپے انہیں اس پاگل امیر سے مل ہی گئے ہوں گے"۔ ایک اور صاحب کہہ رہے تھے "سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا گورکھ دھندا ہے۔ اگر کل کو "فرسٹ اپریل" (FIRST APRIL) ہوتا تو ہم اسے اخبار والوں کی شرارت سمجھ لیتے مگر "فرسٹ اپریل" کو گزرے ہوئے بھی ایک مہینہ ہو گیا ہے۔ میرے خیال میں تو کسی منچلے نے "فرسٹ اپریل فول کی بجائے "سیکنڈ مے فول" (SECOND MAY FOOL) بنانے کا فیصلہ کیا ہے اور وہ بھی بہت وسیع پیمانے پر"

ایک پنڈت جی فرما رہے تھے "یہ اشتہار دینے والے ضرور "کلکی بھگوان" ہوں گے کیونکہ شاستروں کے کہنے کے مطابق آجکل ہی "کلکی اوتار" ہونے کا سمے (وقت) ہے۔ بھگوان کرشن نے بھی تو گیتا میں فرمایا ہے کہ جب سنسار میں پاپ حد سے زیادہ بڑھ جاتا ہے اور لوگ اپنے دھرم کرم کو بھول جاتے ہیں تو ایسے سمے میں میں اوتار لیتا ہوں کیونکہ آجکل پاپ اور بھرشٹاچار (بے ایمانی) حد سے زیادہ بڑھ گئے ہیں اس لئے ضرور بھگوان نے جنم لے لیا ہے"

دو مئی کو اخباروں میں یہ اشتہار پھر شائع ہوا۔ آج لوگوں میں کل سے بھی

زیادہ جوش و خروش پایا جاتا تھا کیونکہ اشتہار کے مطابق آج ٹھیک بارہ بجے سورج نے پانچ منٹ کے لئے غروب ہونا تھا۔ ہندوستان کے کونے کونے میں اسی اشتہار کے متعلق چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ لوگوں کا اشتیاق حد سے زیادہ بڑھا ہوا تھا اور وہ بڑی بے صبری سے بارہ بجنے کا انتظار کر رہے تھے

اُس دن دکانوں، کارخانوں اور دفتروں وغیرہ میں کہیں بھی معمول کے مطابق کام شروع نہ ہو سکا۔ مالک اور نوکر، کلرک اور افسر سب اسی اشتہار کے متعلق باتیں کر رہے تھے۔ کوئی دوسری بات اُنہیں سوجھتی ہی نہیں تھی۔ وہ بار بار بے تابی سے اپنی اپنی گھڑیوں کو دیکھ رہے تھے۔ انہیں ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے ایک ایک منٹ ایک ایک گھنٹے کے برابر ہو گیا ہے۔

بارہ بجنے میں پانچ منٹ رہ گئے تھے۔ لوگوں میں ایک قسم کی ہیجانی کیفیت پائی جاتی تھی۔ وہ بار بار آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ مطلع بالکل صاف تھا۔ سورج اپنی پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔

بارہ بجنے میں دو منٹ رہ گئے تھے۔ لوگوں کے دلوں کی دھڑکنیں تیز تر ہوتی جا رہی تھیں۔ سارے ہندوستان کی آنکھیں آسمان کی طرف لگی ہوئی تھی۔ سب لوگ گھروں، دکانوں اور دفتروں سے باہر نکل آئے تھے گلیوں، بازاروں، سڑکوں، پارکوں اور مکانوں کی چھتوں پر انسانی سروں کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ مئی کے تپتے ہوئے سورج کی دھوپ میں بھی لوگ بڑے اشتیاق سے کسی انہونی چیز کو دیکھنے کا انتظار کر رہے تھے۔ دھوپ کی شدت کی وجہ سے لوگوں کے گال تمتما رہے تھے۔

وہ بار بار اپنی انگلیوں سے ماتھے پر آئے ہوئے پسینے کے قطروں کو جھٹک رہے تھے ۔ پانی کے گلاس کے گلاس پیئے جا رہے تھے ۔ کئی جگہ بانس کی تیلیوں پہ چپکائی ہوئی آئس کریم کی قلفیاں کھائی جا رہی تھیں ۔ کئی عورتوں کی گود میں ننھے منے بچے دھوپ کی شدت کی وجہ سے بلک رہے تھے ۔ فضا میں ایک عجیب قسم کا شور مچا ہوا تھا ۔ یہ شور ایسے شور سے مشابہ تھا جو کہ کسی جلسہ گاہ میں کسی بڑے لیڈر کے آنے سے پہلے ہوتا ہوتا ہے ۔

بارہ بجنے میں چند سیکنڈ رہ گئے تھے ۔ ایک شخص نے اپنے ساتھی سے کہا " لو بھئی نظارہ دیکھنے کے لئے تیار ہو جاؤ " اسے نظارہ کیا دیکھنا ہے میں تو کہتا ہوں کسی منچلے نے تمام ہندوستان کو بے وقوف بنا دیا ہے ۔ بھلا کبھی دوپہر کو سورج غروب ہو کر تارے دکھائی دے سکتے ہیں ؟" ابھی اس شخص کی زبان سے یہ الفاظ پوری طرح نکلنے بھی نہ پائے تھے کہ ٹھیک بارہ بج گئے ۔ سورج یکدم غائب ہو گیا ۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے ابھی ابھی آسمان نے اسے نگل لیا ہے ۔ ہر طرف اندھیرا چھا گیا ۔ آسمان پہ تارے دکھائی دینے لگے ۔ گرمی کی جگہ خنکی نے لے لی ۔ ابھی ابھی جو لوگ گرمی کی وجہ سے پسینے میں شرابور تھے وہ ہلکی سردی محسوس کرنے لگے ۔ اندھیرے میں مختلف قسم کی آوازیں آ رہی تھیں ۔ کوئی ایشور بھگت کہہ رہا تھا " دھن ہو بھگوان ۔ تمہاری لیلا اپرم پار ہے " بہت سے لوگ زور زور سے اس طرح ہرے رام ۔ ہرے رام کی رٹ لگانے لگے جیسے کہ بھونچال سے آنے پہ لگتے ہیں ۔ بعض جگہوں پہ تو باقاعدہ کیرتن ہونے لگا ۔ ہرے راما ہرے راما ہرے کرشنا کرشنا ہرے

بھرے" مسلمانوں نے خدا کی تعریف میں قوالیاں اور نعتیں گانا شروع کر دیں سکھوں نے زور شور سے شبد گانے شروع کر دیئے ۔ لمحہ بہ لمحہ کیرتن کرنے والوں کی نعتیں اور شبد گانے والوں کی آوازیں اونچی اور تیز ہوتی جا رہی تھیں ۔ ان کے جوش و خروش سے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اب ہندوستان میں کوئی ناستک نہیں رہا ہے ۔ سب روحانیت کے رنگ میں رنگے گئے ہیں

بارہ بج کر پانچ منٹ ہو گئے ۔ نہ جانے سورج کہاں سے پھر یکدم نکل آیا ۔ تاریکی اجالے میں بدل گئی ۔ لوگ یکدم اس تیز روشنی کی تاب نہ لا سکے ان کی آنکھیں چندھیا گئیں ۔ انہوں نے اپنی آنکھوں پر اپنے ہاتھ رکھ لئے اور تھوڑی دیر بعد آہستہ آہستہ اٹھ گئے ۔ سب لوگ گلیوں، بازاروں اور چھتوں سے واپس اپنی اپنی جگہ آ گئے ۔ رکا ہوا ٹریفک پھر سے جاری ہو گیا لوگوں میں ایک نئی زندگی کی لہر پائی جاتی تھی ۔ عام طور پر یہی چرچا تھا کہ ست یگ آ گیا ہے ۔

اس معجزے کے بعد نامہ نگاروں کو خدا کی تلاش ہوئی ۔ انہوں نے ان اخباروں کے دفتروں میں جا کر خدا کا پتہ معلوم کیا جن میں اس کا اشتہار چھپا تھا ۔ خدا کا پتہ تھا "کمرہ نمبر ١٦ اشوکا ہوٹل نیو دہلی"

تھوڑی ہی دیر میں اشوکا ہوٹل میں نامہ نگاروں اور فوٹو گرافروں کا ہجوم جمع ہو گیا ۔ خدا کے متعدد فوٹو لئے گئے ۔ خدا نے پریس میں چھپنے کے لئے ایک بیان بھی دیا ۔ آل انڈیا ریڈیو (آکاشوانی) کے نامہ نگار نے خدا سے ریڈیو پر ایک تقریر براڈکاسٹ کرنے کی درخواست کی جسے خدا نے

بخوشی منظور کر لیا۔ تقریر کا وقت ساڑھے آٹھ بجے شام مقرر کیا گیا۔

اسی روز دوپہر کو ریڈیو پہ ایک بج کر چالیس منٹ والے خبروں کے بلیٹن کو اس طرح سنایا گیا۔ "یہ آکاش وانی ہے۔ اس وقت ایک بج کر چالیس منٹ ہوئے ہیں۔ اب آپ شری نندن پانڈے سے ہندی میں سماچار سنئے۔ آپ کو یہ سن کر اتینت پرسنتا (نہایت خوشی) ہوگی کہ پرم پتا بھگوان آجکل بھارت میں پدھارے ہوئے ہیں اور وہ اشوکا ہوٹل نئی دہلی میں مقیم ہیں۔ آج دوپہر کو بارہ بجے سترہ منٹ پر پانچ منٹ کے لئے الوپ (غائب) ہو گیا تھا۔ وہ بھگوان کی مہا شکتی (عظیم طاقت) کا ایک چھوٹا سا نمونہ تھا۔ انہیں اپنی شکتی کا پردرشن (مظاہرہ۔ نمائش) اس لئے کرنا پڑا کہ لوگوں کو ان کے بھگوان ہونے میں کوئی شک نہ رہے۔ انہوں نے چلتے سمواد داتا (نامہ نگار) سے کہا ہے کہ وہ دھرتی پر انسان کے روپ میں اس لئے آئے ہیں تاکہ وہ جنتا کی تکلیفوں کا اندازہ اچھی طرح لگا سکیں۔ آج شام کو ساڑھے آٹھ بجے پرم پتا بھگوان جی ریڈیو پر راشٹر کے نام ایک سندیش براڈکاسٹ کریں گے۔ یہ سندیش آکاش وانی کے تمام کیندروں سے ایک ساتھ پرسارت (ریلیز) کیا جائے گا۔"

ریڈیو پر خبریں سننے کے بعد لوگوں کا ایک بہت بڑا ہجوم اشوکا ہوٹل کے سامنے خدا کے درشنوں کے لئے جمع ہو گیا۔ خدا نے انہیں کئی دفعہ درشن دیئے مگر ہجوم بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ آس پاس کی تمام سڑکوں پر ٹریفک بند ہو گیا۔ ہجوم خدا کو دیکھنے کے لئے بار بار نعرے لگا رہا تھا۔

ہوٹل والوں نے جب دیکھا کہ ہجوم کے جوش و خروش کی وجہ سے ہوٹل کی عمارت کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے تو انہوں نے فوراً پولیس کو ٹیلیفون کیا۔ پولیس آئی اور خدا کو چپکے سے پوشیدہ طور پر نکال کر ایک نامعلوم مقام پر لے گئی یہاں سے اُسے تھوڑی دیر بعد راشٹرپتی بھون پہنچا دیا گیا۔

ریڈیو پر ہر پانچ منٹ کے بعد خدا کی تقریر کرنے کا اعلان ہو رہا تھا۔ سارے ملک میں ایک قسم کی ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ کئی لوگ تو خدا کو دیکھنے کے اشتیاق میں دہلی چل پڑے تھے۔

شام کو کئی اخباروں نے خاص ایڈیشن شائع کئے۔ جس میں خدا کے دہلی آنے۔ برلا مندر اور جامع مسجد وغیرہ سے بے آبرو ہو کر نکلنے، اشتہار مٹنے اور سورج کو غروب کرنے کے حالات چھپے ہوئے تھے۔ اسی ضمن میں چند ایک دلچسپ خبریں بھی چھپی ہوئی تھیں۔ وہ یہ تھیں کہ جب سورج کے غروب ہو جانے پر پانچ منٹ کے لئے اندھیرا چھا گیا تو چوروں کے لئے ایک نادر موقعہ ہاتھ آ گیا۔ انہوں نے کئی دکانوں کی تجوریاں صاف کر دیں جیب کتروں کے بھی وارے نیارے ہو گئے۔ چند غنڈوں نے اندھیرے میں عورتوں سے چھیڑ خانی بھی کی۔

ایک خبر یہ بھی تھی کہ دوپہر کو سورج کے یکدم چھپ جانے کی وجہ سے پسینے میں شرابور لوگوں میں سے کئی ایک کو اچانک سردی محسوس ہونے کی وجہ سے نزلہ اور زکام کی شکایت پیدا ہو گئی ہے۔ چند ایک نازک طبیعت والوں کو نمونیا بھی ہو گیا ہے اور پانچ منٹ کے مسلسل اندھیرے

کی طرح یکدم سورج نکلنے سے کہ تمام دنیا کی منافقت کا بڑا اثر پڑا ہے۔

شام کے ساڑھے آٹھ بجے اسٹیشن پر تمام لوگ ریڈیو پر خدا کی آواز سننے کے منتظر تھے۔ ساڑھے آٹھ بجے اناؤنسر نے اعلان کیا کہ ہم آکاش وانی کے دہلی کیندر سے بول رہے ہیں۔ اس وقت شام کے ساڑھے آٹھ بجے ہیں۔ اب آپ پرم پتا سرو شکتیمان شری بھگوان جی کا سندیش سنیں گے یہ سندیش آکاش وانی کے تمام کیندروں سے ایک ساتھ براڈکاسٹ کیا جا رہا ہے

خدا کی تقریر شروع ہوئی۔

"میرے پیارے بچو۔

میں اپنے آپ کو آپ کے درمیان پا کر بہت خوشی محسوس کر رہا ہوں۔ میرا اس دنیا میں آنے کا ایرا (مقصد) تو آپ نے پڑھ ہی لیا ہوگا۔ میں ایک انسان کے روپ میں آپ کے دکھوں، تکلیفوں اور مصیبتوں کا اثر بخود اندازہ کرنے آیا ہوں۔ کیونکہ آکاش میں میرے کانوں میں وقتاً فوقتاً اس دنیا کی طرف سے کئی ایسی صدائیں اور فریادیں سنائی دیتی رہتی تھیں۔ جیسے کہ "جاؤ تیرے بھگوان ہے انسان تو جانیں"۔ "اے دنیا بنانے والے خدا اسے سنے تو" "بھگوان دو گھڑی فرد انسان بن کے دیکھو"۔ وغیرہ وغیرہ۔ تو میں نے ایسی آوازوں کو سن کر یہ فیصلہ کیا کہ میں انسان کے بھیس میں دھرتی پر جاؤں۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ میں مندر، مسجد اور گوردوارے میں گیا مگر مجھ پر کسی نے اعتبار نہیں کیا۔ اس لئے مجھ کو اپنے خدا ہونے کا یقین دلانے کے لئے سورج کو چھپا کر دن کو رات سے بدلنے کا میریکل (Miracle) یعنی معجزہ کرنا پڑا۔

یہاں میں ایک بات آپ سے کلیر (CLEAR) کرنی چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ آپ ضرور میری اس ہندی، اردو اور انگریزی کی کھچڑی زبان کو سن کر ہنستے ہوں گے مگر میں کیا کروں مجبوری ہے۔ اگر میں کسی ایک زبان میں تقریر کروں تو دوسری زبان بولنے والے مجھ سے ناراض ہو جائیں گے۔ وہ مجھ پر الزام لگائیں گے کہ میں دوسرے مذہب والوں کا فیور (FAVOUR) کرتا ہوں اس لئے مجھے یہ کھچڑی زبان بولنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے۔

ہاں۔ تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ مجھے ان فریادوں کو سن کر زمین پر آنا ہی پڑا۔ میں کل رام لیلا گراؤنڈ میں ایک دربار منعقد کر رہا ہوں جس میں آپ لوگوں کی شکایتیں سنوں گا۔ اور حتی الوسع انہیں دور کرنے کی کوشش کروں گا۔ دربار کل شام کو پانچ بجے لگے گا۔

آخر میں میں آپ سے مل جل کر رہنے کی اپیل کرتا ہوں۔ تمام مذاہب کے لوگ میرے ہی بندے ہیں۔ کسی دوسرے مذہب کے لوگوں سے نفرت مت کرو۔ زبان کے جھگڑوں میں نہ پڑو اسی میں آپ کی بھلائی ہے۔ سجے ہند۔

اس رات خدا کے اعزاز میں راشٹرپتی بھون میں ایک شاندار ڈنر پارٹی دی گئی اور غیر ملکی سفیروں اور دیگر بڑے بڑے لوگوں کو خدا سے متعارف کرایا گیا۔ غیر ملکی سفیروں نے خدا کو اپنے ملک میں آنے کی دعوت دی جس کے جواب میں خدا نے ان سے وعدہ کیا کہ وہ مناسب وقت آنے پر ان کے ملکوں کا بھی دورہ کریگا۔

اس رات کو مندروں، مسجدوں، گردواروں اور گرجا گھروں میں خاص پرارتھنا

سبھائیں بھی منعقد کی گئیں اور لوگ ساری عبادت خدا کی تعریف میں بھجن منتیا
اور شبد وغیرہ گاتے رہے۔
دوسرے دن اخبارات نے خاص ایڈیشن شائع کئے جن میں
خدا کی تصویریں اور اس کے دنیا میں آنے کا مکمل حال چھپا ہوا تھا۔ خدا کے
بارے میں لمبے لمبے ایڈیٹوریل لکھے گئے۔ ذیل میں چند ایک اخبارات کے
ایڈیٹوریلز کے اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔
ہندو سبھا کے اخبار روزانہ "اکھنڈ بھارت" نے لکھا "بھگوان نے ایک دفعہ
پھر سے بھارت میں آکر اس کی پرانی عظمت کی یاد تازہ کر دی ہے۔ دنیا
کو ماننا ہی پڑے گا کہ بھارت دیوی دیوتاؤں کا دیش ہے۔ اسی دیش سے
ہی تمام دنیا کو روحانیت کا سبق مل سکتا ہے۔" آخر میں لکھا تھا "بھارت
کے سب نر ناری بھگوان کا ہاردک سواگت (دل سے استقبال) کرتے
ہیں اور ان کے پوتر چرنوں میں اپنی شردھا کے پھول پیش کرتے ہیں"
اکالی اخبار روزانہ "پنجابی صوبہ" نے لکھا "ہمیں بھگوان کی ہندوستان میں
تشریف لانے کی خوشی ہے لیکن ساتھ ہی اس بات کا رنج بھی ہے کہ
انہوں نے یہاں اپنی تقریر میں ہندی۔ اردو اور انگریزی کے الفاظ مل
کھول کر استعمال کئے وہاں بھولے سے بھی پنجابی کا ایک لفظ بھی ان کی زبان
سے نہیں نکلا۔ اور نہ ہی انہوں نے اپنی تقریر میں پنجابی صوبے کے بارے
ذکر کیا جو کہ سکھوں کی سب سے بڑی مانگ ہے۔ بھگوان کی اس
تقریر سے مایوس ہو کر پنتھ رتن ماسٹر تارا سنگھ جی نے تہیہ کیا ہے

کر احتجاج کے طور پر بھگوان کے پاس دہلی میں جیتے جی بھیجے جائیں۔ یہ سب جیتے پہلے مارچ کو دہلی اور یہ دہلی پہنچ کر اس وقت تک چین نہ لیں گے جب تک کہ بھگوان ان سے پنجابی صوبہ بنانے کے سوال پر غور کرنے کا وعدہ نہ کر لیں"۔

کمیونسٹوں کے اخبار "کسان مزدور راج" نے لکھا: "خدا جانے کل کانگریس نے کہاں سے ایک جادوگر کو بلا کر اس کی شعبدے بازی کے ذریعہ تمام ہندوستان میں دن کے بارہ بجے پانچ منٹ کے لئے سورج کو غروب کروا دیا اور مشہور یہ کر دیا کہ یہ شخص جادوگر نہیں خدا ہے۔ ہم عوام کو سامراجیوں کی اس خطرناک اور مکروہ چال سے خبردار کرنا چاہتے ہیں۔ دنیا میں خدا کا کوئی وجود نہیں ہے۔ نام نہاد خدا کی آمد محض ایک چال ہے۔ اب سامراجی اس شخص کو اپنے پراپیگنڈے کے لئے استعمال کریں گے۔ عوام کو پھر سے مذہب کے جال میں پھانسنے کی کوشش کریں گے اور اس طرح ان کی توجہ سیاسی اور معاشی معاملات کی طرف سے ہٹانے کی ذلیل چالیں چلیں گے"۔ آگے چل کر لکھا تھا: "روسی سائنسدان اس شعبدہ بازی کے متعلق سرتوڑ تحقیق کر رہے ہیں۔ ہمیں پوری امید ہے کہ جلد ہی وہ اس نام نہاد خدا کی خدائی کے ڈھول کا پول کھولنے میں کامیاب ہو جائیں گے اور سامراجی چالوں کو بے نقاب کر دیں گے۔ سائنس کی اس دنیا میں اب شعبدوں کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی ہے"۔

اسی دن یعنی ۳ مئی کی شام کو رام لیلا گراؤنڈ میں خدا کا شاندار دربار لگا۔ بڑے بڑے شامیانے لگائے گئے۔ خدا کے بیٹھنے کے لیے ایک نہایت ہی خوبصورت اور بیش قیمت چبوترہ رکھا گیا اور اس کے سامنے گاؤ اور گدے بچھونے

دائرے کی شکل میں دور دور تک بڑے بڑے آدمیوں کے بیٹھنے کے لئے قیمتی صوفے بچھے ہوئے تھے۔ جنتا کے لئے دریاں بچھائی گئی تھیں۔ لاؤڈ سپیکروں کا خاطر خواہ انتظام تھا۔ ٹھیک پانچ بجے خدا کی کار جلسہ گاہ میں پہنچی۔ پنڈال "بھگوان کی جے ہو"۔ "خدا زندہ باد" اور "لانگ لیو گاڈ"۔ LONG LIVE GOD کے نعروں سے گونج اٹھا۔ خدا اپنے صوفے پر جا کر بیٹھ گیا۔ جب اس نے آس پاس کے صوفوں پر نظر ڈالی تو ان میں سے کئی صوفے اسے خالی نظر آئے۔ چند لمحوں کے بعد خدا اٹھا اور اس نے ممبروں اور مہمانوں میں سے بعض کی غائبیت پر افسوس ظاہر کرتے ہوئے ایک مختصر سی تقریر کی اور اس کے بعد کاروائی شروع کرنے کا حکم دیا۔ دربار کے سیکرٹری نے لاؤڈ سپیکر پر دربار کی باقاعدہ کاروائی شروع ہونے کا اعلان کیا اور لوگوں سے کہا کہ وہ باری باری اپنی شکائتیں خدا کے حضور میں پیش کر سکتے ہیں۔ پیشتر اس سے کہ کوئی شخص آ کر اپنی فریاد سناتا جلسہ گاہ کے باہر ایک شور سا برپا ہو گیا۔ زور زور سے نعرے لگنے کی آوازیں آنے لگیں۔ نعرے کچھ اس قسم کے تھے: "ہمیں نہیں چاہیئے گاڈ۔ خدا یا بھگوان" "ہمیں چاہیئے روٹی، کپڑا اور مکان"۔ "گو بیک خدا گو بیک" خدا نے پنڈال سے باہر دیکھا تو اس کی نظر ایک جلوس پر پڑی جس کی رہنمائی کمیونسٹوں کے لیڈر کامریڈ نانگیہ اور چالیس کے قریب جلوس میں شامل لوگوں کے ہاتھوں میں کالی جھنڈیاں تھیں۔ خدا کو دیکھ کر انہوں نے کالی جھنڈیاں ہلا ہلا کر پھر زور شور سے نعرے بلند کرنے شروع کر دیئے "گو بیک خدا گو بیک" "واپس جاؤ خدا واپس جاؤ" "ہمیں نہیں چاہیئے گاڈ۔ خدا یا بھگوان" "ہمیں چاہیئے

روڈی ٹیپرا اور منان" ابھی کیمونسٹوں کے اس جلوس کے نعرے مدھم نہیں ہوئے تھے کہ ان کے جلوس کے پیچھے اکالی سکھوں کا ایک جلوس آ پہنچا۔ وہ یہ نعرہ لگا رہا تھا۔ "چاہے ہو جائے خون خرابہ لے کے رہیں گے پنجابی صوبہ"۔ "چاہے ہو جائے [illegible] لے کے رہیں گے پنجابی صوبہ"۔

ان دونوں جلوسوں کے مل جانے سے فضا نعروں سے گونج اٹھی۔ ہر طرف شور اور غل غپاڑہ مچ گیا۔ کانوں پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ جلوس والوں نے پنڈال میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو زبردستی گھسیٹ کر باہر نکالنا شروع کر دیا۔ اداسی اور ابتری کے عالم میں خدا کا دربار برخاست ہو گیا۔

جب خدا کار میں بیٹھ کر جلسہ گاہ سے جانے لگا تو جلوس کے آدمیوں نے کار کے آگے کھڑے ہو کر اسے روک دیا اور خدا کو گھسیٹ کر کار سے باہر نکالنے کی کوشش کرنے لگے۔ اس پر خدا کے حامیوں اور اس کے مخالفوں میں ہاتھا پائی تک نوبت پہنچ گئی۔ اب پھر کیا تھا تمام گراؤنڈ میں ایک زبردست فساد شروع ہو گیا۔ مخالفین نے گھونسوں اور ڈنڈوں سے ایک دوسرے کی مرمت کرنی شروع کر دی۔ جلوس کے مخالفین نے کالی جھنڈیوں کو پھاڑ دیا اور جلوس والوں نے پنڈال میں پڑے ہوئے صوفوں ... اور دریوں کو آگ لگا دی۔ لاؤڈ سپیکر توڑ پھاڑ دیئے گئے۔ اسی دوران میں خدا مخالفین کے ہتھے چڑھ گیا۔ خدا کے کپڑے پھاڑ دیئے گئے۔ تھپڑوں، گھونسوں اور ٹھڈوں سے اس کی تواضع کی گئی۔ ایک منچلے نے اس کے منہ پر سیاہی بھی پوت دی۔ خدا بڑی مشکل سے اپنی جان بچا کر بھاگا اور یہ شعر کہتا ہوا آسمان کو

واپس چلا گیا۔

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن
بہت بے آبرو ہو کر یہاں اپنے سے نکلے

دوسرے دن ایک سرکاری پریس نوٹ میں بتایا گیا کہ کل کے فساد میں دو ہزار چار سو چھیانوے (۲۴۹۶) افراد زخمی ہوئے۔ دو ہزار ایک سو چھیانوے کے تو معمولی چوٹیں آئی تھیں اس لئے ان کی مرہم پٹی کر کے انہیں گھر جانے کی اجازت دے دی گئی۔ باقی تین سو آدمیوں کے سخت چوٹیں آئی تھیں اس لئے انہیں مختلف ہسپتالوں میں داخل کر دیا گیا ہے۔ کسی شخص کی موت کی اطلاع نہیں ملی ہے۔ مالی نقصان کا اندازہ تیس ہزار روپے کے قریب لگایا گیا ہے۔ شہر میں دفعہ ایک سو چوالیس (۱۴۴) لگا دی گئی ہے۔ مسلح پولیس اور ملٹری کی بکتر بند گاڑیاں شہر میں گشت لگا رہی ہیں۔

لیڈروں نے شہر میں گھوم پھر کر لوگوں کو پر امن رہنے کی تلقین کی۔ کمیونسٹ لیڈروں نے ہوم منسٹر کو ایک خط لکھا جس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ خدا کو ملک کے اندرونی نظام میں تخریبی ڈالنے کے جرم میں گرفتار کر کے اسے سخت سے سخت سزا دی جائے۔ کیونکہ نہ وہ ہندوستان میں آتا اور نہ ہی یہ فساد ہوتا۔

جب خدا واپس گیا چہرہ تھا اس کا داغدار
جسم پر تھے زخم اس کے اور دامن تار تار

جھٹ پٹ پبلشنگ ہاؤس

ایڑی چوٹی کا زور لگا کر ناول لکھنے کے بعد سب سے بڑی زحمت جو ہمیں اٹھانی پڑی وہ کسی اچھے اور قابلِ اعتبار ناشر اور پبلشرز کو تلاش کرنے کی تھی۔ لیکن پبلشرز تلاش کرنا ناول کے پلاٹ کو ڈھونڈنے سے بھی زیادہ دشوار ثابت ہوا۔ جس کسی کے پاس گئے اس نے نہایت انکساری کے ساتھ ہمارے ناول کو چھاپنے سے معذوری کا اظہار کر دیا۔ چند ایک نے تو اس قدر کمر توڑ اور حوصلہ شکن جواب دیا کہ ہمیں واقعی اس بات کا احساس ہونے لگا کہ جتنا عرصہ ہم نے ناول لکھنے میں برباد کیا ہے اگر اس کی بجائے ہم ملین سگریٹ کی دوکان کھول لیتے یا گول گپوں کا خوانچہ ہی لگا لیتے۔ تو یقیناً فائدے میں رہتے۔

سب سے پہلے ہم "سنتو فیض کتاب گھر" والوں کے ہاں گئے تاکہ ان کے
مطبع سے اپنے ناول کو چھپوانے کا انتظام کر سکیں۔ مگر ان کے مینیجر صاحب
نہایت ہی ملائم الفاظ میں اپنی مجبوری ظاہر کرتے ہوئے فرمانے لگے "دیکھئے جناب
ہم صرف جاسوسی و سراغ رسانوں کی معرکہ خیز کہانیوں کی سرگزشتیں وغیرہ ہی چھاپتے ہیں، ورنہ قسم
گنگیا امیسر کی اگر ہمیں آپ نے یہ ناول ہم اس لیے پورا نہیں پڑھا ورنہ آپ کو یہ زحمت
ہرگز نہ اٹھانی پڑتی۔ بہرحال میں آپ سے معافی کا خواستگار ہوں"۔ یہ الفاظ
سن کر ہم بھی مینیجر صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے دکان سے باہر آ گئے

تھوڑی دیر سوچنے کے بعد ہم "ادب نو پبلشرز" والوں کے ہاں جا پہنچے
ان کا دفتر نہایت شاندار تھا۔ دیواروں میں بنی بڑی صاف و شفاف شیشے کی
الماریوں میں سے نہایت دلفریب اور رنگین گرد پوش والی کتابیں باہر جھانک رہی تھیں۔
مینیجر صاحب ہمیں دیکھتے ہی بول اٹھے "آئیے آئیے تشریف لائیے" اور مصافحہ
کرنے کے لئے ایسی تیزی سے ہاتھ بڑھایا جیسے کوئی سدھایا ہوا کتا گیند
کو اپنی طرف آتا دیکھ کر اپنا منہ کھولے ہوئے اسے پکڑنے کو لپک پڑتا ہے
ہم مصافحہ کر کے ایک کرسی پر بیٹھ گئے اور اپنے آنے کا مقصد بیان کیا۔ مینیجر
صاحب نے ہونٹوں پر ایک کاروباری مسکراہٹ لاتے ہوئے فرمایا "بڑی خوشی
کی بات ہے بہت اچھا کیا آپ نے۔ ہاں تو کیا اس سے پہلے بھی آپ کی کوئی کتاب
چھپ چکی ہے؟"

"جی نہیں" ہم نے جھینپتے ہوئے جواب دیا "یہ ہماری پہلی ادبی کاوش ہے"!
"بہت خوب۔ بہت خوب۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ" یہ آپ نے

بہت اچھا کیا یہ آپ اپنی کتاب چھپوانے کے لئے ہمارے پاس چلے آئے۔ ہم اپنے لکھنے والوں کو اُن کی تصنیفات کا پورا پورا معاوضہ دیتے ہیں۔ دوسرے پبلشروں کی طرح کسی کا حق نہیں دباتے۔ اسی لئے ہم نے اپنے کتاب گھر کا نشان ترازو رکھا ہوا ہے۔ جو کہ انصاف اور مساوات کا عین مظہر ہے۔"

"جی ہاں کیجئے آپ کے۔ آپ کی وضعداری کی تو دھوم مچی ہوئی ہے۔ اگر آپ کے بلند پایہ ناشر خانہ سے میری کتاب چھپ جائے تو میں اپنے آپ کو نہایت خوش قسمت سمجھوں گا۔" ہم نے بھی تجارتی اندازِ گفتگو اختیار کرتے ہوئے فرمایا۔

تھوڑی دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد منیجر صاحب نے کتاب کا مسودہ ہمارے ہاتھ سے لیا اور چہرے کو نہایت سنجیدہ بنا کر اُسے ترازو میں تولنے لگے۔

ہم مجسمۂ حیرت بنے ہوئے اس کارروائی کو دیکھتے رہے۔

"ایک سیر اڑھائی چھٹانک کے قریب ہے آپ کا ناول" منیجر صاحب نے ترازو پر سے نظریں اٹھاتے ہوئے ہمیں اطلاع دی۔

"کیا مطلب؟" ہم نے ذرا چونک کر پوچھا۔ خدا کی قسم ہم نے ساری زندگی میں ایسا حیرت انگیز سودا کبھی نہیں دیکھا تھا۔

"بہت بھولے ہیں آپ بھی" منیجر صاحب مسکراتے ہوئے بولے "مطلب یہ ہے کہ ہم کتابیں تول کر لیتے ہیں۔"

ہمارے دل میں امید کی کرن ایک دفعہ پھر چمک اٹھی۔ ہم نے سوچا کہ اگر یہ مسودے کو پڑھنے کی بجائے تول کر لیتے ہیں۔ تو فی سیر ہزار بارہ سو روپے ضرور لیں گے۔ دل ہی دل میں ہم اپنی سوچ پر شرمندہ ہوئے۔ اور پھر ہمارے ایک

خشک سی ہنسی لاکر دریافت کیا۔ "گستاخی معاف ہمیں سمجھا نہیں تھا۔"

"کوئی بات نہیں، کوئی بات نہیں!" منیجر صاحب نے ذرا تسکین آمیز لہجے میں کہنا شروع کیا۔

"اچھے اچھے نامور ادیبوں کو تو ہم چالیس سے لیکر پچاس روپے سیر تک خرید لیتے ہیں۔ چونکہ آپ ابھی نئے نئے لکھنے والے ہیں۔ اس لیے فی الحال آپ کو بیس روپے سیر کے مل جائیں گے۔"

ابھی ڈیڑھ سال کی دماغ سوزی کو اتنا ارزاں جاتا دیکھ کر ہمارا خون کھول اٹھا۔ جی میں آرہا تھا کہ میز پر پڑے ہوئے ترازو کو اٹھا کر منیجر صاحب کے سر پر دے ماریں۔ مگر موقع و محل کی مصلحتوں کو دیکھ کر ہمیں اپنے اس ارادے کو ملتوی ہی کرنا پڑا۔ ہم نے خون کے گھونٹ پی کر منیجر صاحب سے پوچھا "اجی صاحب۔ مذاق کیوں کرتے ہیں کچھ کام کی بات کیجیے۔"

"یہ مذاق کی بھی آپ نے خوب کہی۔ میں مذاق میں کرتا ہوں یا آپ۔ بیس روپے سیر تو میں نے آپ کا دل رکھنے کے لئے کہہ دیا ہے۔ ورنہ نئے لکھنے والوں کو تو میں پندرہ روپیہ فی سیر سے زیادہ کبھی دیتا ہی نہیں ...... کہیئے تو دے دوں تیس روپے وہ کسے ایک سیر اڑھائی چھٹانک کے ؟"

ہم منیجر صاحب کے سامنے بیٹھے ہوئے دل ہی دل میں سٹپٹا رہے تھے۔ ارادہ تو کچھ اور ہی تھا مگر فوجداری چل جانے کے ڈر سے ہم صبر کر کے دفتر سے باہر آ گئے۔ طبیعت کافی پریشان ہو چکی تھی۔ اس لئے کسی اور پبلشر سے ملنے کی بجائے ہم سیدھے گھر واپس آ گئے۔

دوسرے دن ہم نئے ارادوں اور نئی اُمنگوں سے مسلح ہو کر گھر سے نکلے
اور "مکتبہ ترقی پسند" کے ناظم سے ملے۔ انہوں نے فرمایا کہ وہ صرف ترقی پسند
لٹریچر ہی شائع کرتے ہیں۔ جب ہم نے انہیں یقین دلایا کہ ہمارا ناول سو فیصدی ترقی
پسند ہے تو انہوں نے مسودے کو لے کر رکھ لیا اور فرمایا کہ آٹھ دن کے
بعد وہ مسودے کو پڑھ کر اپنی رائے دیں گے۔ خیر جوں توں کر کے ہم نے آٹھ
دن بھی گذار دیے۔ جب آٹھ دن بعد اُن کا فیصلہ معلوم کرنے کے لیے گئے
تو انہوں نے ہمیں دیکھتے ہی مسودہ ہمارے ہاتھ میں تھما دیا۔ اور فرمانے لگے۔
"ساتھی! آپ کا ناول ہرگز ترقی پسند نہیں ہے۔ نہ تو اُس میں مزدور اور سرمایہ دار
کی کشمکش ہی دکھائی گئی ہے۔ اور نہ ہی کسانوں کی تحریک کا کوئی ذکر کیا گیا
ہے۔ ہڑتالوں، مظاہروں، لاٹھیوں اور گولیوں کا ذکر تو آپ نے بھول کر
بھی نہیں کیا۔ ترقی پسندی تو آپ کے ناول میں خوردبین سے دیکھنے پر
بھی دکھائی نہیں دیتی۔"

"معاف کیجیے گا" ہم نے کامریڈ صاحب کو جواب دیتے ہوئے کہا "صرف
سرمایہ دار اور مزدور کی کشمکش کی جذباتی عکاسی کرنے کا نام ترقی پسندی
نہیں ہے ہمیں پیٹ کی بھوک کے علاوہ انسان کی اخلاقی اور روحانی بھوک
کو بھی مٹانا ہے ہم صرف روٹی کھانے کے لیے ہی اس دنیا میں پیدا نہیں
ہوئے ہیں بلکہ قدرت ہم سے بہت کچھ چاہتی ہے۔"

"چلیے آپ کا یہ نظریہ درست ہی سہی" کامریڈ صاحب بولے "لیکن آپ کے
ناول میں ایک اور زبردست کمی ہے وہ یہ کہ آپ کے ناول میں ہم

نے لفظ "سرخ" کو ڈھونڈنے کی ہر ممکن کوشش کی ظاہر کی آنکھیں چھوڑ
کر باطن کی آنکھوں سے بھی دیکھنے کی کوشش کی۔ مگر افسوس ہماری یہ حسرت
(لفظ سرخ کو ڈھونڈنے کی) دل ہی دل میں رہ گئی۔ اب آپ کے ناول کو ترقی پسند
کہوں تو کیسے؟ البتہ ناول کا ایکسرے نہیں کیا گیا۔ شاید ایسا کرنے سے ہمیں
ترقی پسندی کا بھی پتہ چل جائے۔"

"ایکسرے چھوڑ دیجیے آپ میرے ناول کا پوسٹ مارٹم کروائیں جب تک
آپ کی آنکھوں پر "سرخ پٹی" بندھی ہوئی ہے آپ کو ترقی پسندی کہیں بھی
نظر نہیں آسکتی"۔ یہ کہہ کر ہم نے کامریڈ صاحب کو "جے ماسکو" کہی اور مسودے
کو بغل میں دبا کر باہر آگئے۔

اس کے بعد ہم نے "آہ پبلشنگ ہاؤس" والوں سے قسمت آزمائی کی ٹھانی
اور ان کے دفتر میں جا پہنچے۔ ایک سن رسیدہ بزرگ نے مری ہوئی آواز میں
ہمارا استقبال کیا۔ انہوں نے سیاہ لباس پہن رکھا تھا۔ سارا فرنیچر سیاہ رنگ
کا تھا۔ میز پوش اور فائیلیں بھی کالے رنگ کی تھیں۔ کتابوں کے گردپوش
بھی اسی رنگ کے تھے۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ہم کسی ادب کدے کی بجائے
کسی ماتم کدے میں داخل ہو گئے ہیں۔ سارے کمرے میں حسرت و یاس کا ماحول
طاری تھا۔ خیر ہم نے ان بزرگ صاحب سے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا
سب سے پہلا سوال جو انہوں نے پوچھا وہ یہ تھا۔

"آپ کا ناول کامیڈی ہے یا ٹریجیڈی؟"

"کامیڈی ہے"

"کامیڈی!"

لفظ کامیڈی سنتے ہی انہوں نے کچھ اس طرح برا سا منہ بنایا جیسے ہم نے انہیں کوئی گالی دے دی ہو۔ چپ چاپ وہ ہماری طرف اس طرح دیکھتے رہے جیسے ہم نے ان کے لطیف جذبات کو بہت بڑی ٹھیس لگا دی ہو۔ چند لمحے تامل کے بعد وہ بولے۔ "معاف کیجئے صاحب ہم آپ کا ناول شائع نہیں کر سکتے"۔

"یہ آپ نے کس طرح کہہ دیا۔ ابھی تک ناول تو آپ نے پڑھا بھی نہیں"۔ ہم نے احتجاج کیا۔

"پڑھنے کی ضرورت ہی نہیں رہی برخوردار۔ آپ نے کامیڈی لکھ کر ثابت کر دیا ہے کہ ابھی تک آپ کو دنیا کا کچھ تجربہ نہیں ہے۔ دنیا میں کامیڈی یعنی خوشی ہے کہاں؟ یہاں تو فقط ٹریجڈی ہی ٹریجڈی ہے۔ یہ دنیا تو دکھوں کا گھر ہے۔ یہاں انسانوں کو طرح طرح کے دکھ جھیلنے پڑتے ہیں۔ ایک تو خدا نت نئے مظالم ایجاد کرتا ہے پھر انسان انسان کا گلا گھونٹتے ہیں۔ دوسروں کا حق چھینتے ہیں۔ غرضیکہ ہر طرف فریب۔ مکر اور ریاکاری کا دور دورہ ہے تمام ماحول غمگین اور اداس ہے ساری فضا آنسوؤں۔ آہوں، سسکیوں اور چیخوں سے بوجھل ہو رہی ہے۔ مگر آپ ہیں کہ ابھی تک کامیڈی لکھ رہے ہیں۔ پتہ نہیں کب آپ لوگوں کا شعور پختہ ہوگا جب آپ حقیقت کا احساس کریں گے"

اس وقت ان کی آواز بھرائی ہوئی تھی اور قریب تھا کہ وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگ پڑیں۔

تھوڑی دیر کے لئے تو ہمیں بھی یہی خیال ہو گیا کہ واقعی ہم نے کامیڈی

لکھ کر بہت بڑی غلطی کی ہے، بہت بڑا گناہ کیا ہے۔ ہم نے ایک سرد آہ بھر کر کہہ دیا .. دیوار کی طرف دیکھا اس پر کچھ اس قسم کے ماٹو ٹنگے ہوئے تھے "موت کو مت بھولو۔ دنیا دکھوں کا گھر ہے" "وہ اصلی سکون موت کی آغوش میں ملتا ہے" اور ان سب سے شاندار ماٹو یہ تھا "زندگی کے معنی ہیں رونا اور چلانا۔ انسان جب پیدا ہوتا ہے تو خود روتا ہے اور جب مرتا ہے تو دوسروں کو رلاتا ہے"

ہم نے اِن بزرگ حضرت سے اپنی اس غلطی (کامیڈی لکھنے کی) کے لئے معافی مانگی اور واپس آ گئے۔ آج طبیعت کچھ کافی پریشان ہو گئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ دنیا واقعی ایک بہت ہی ستم کدہ ہے۔ اور یہاں تمام انسان ایک دوسرے کا ماتم کرنے کے لئے پیدا ہوتے ہیں۔ مگر یہ خیالات دوسرے دن رفوچکر ہو گئے۔ کیونکہ یہ تصویر کا ایک ہی رُخ دکھا رہے تھے۔ اُس میں ہم پھر ایک نئے ناشر خانہ "جھٹ پٹ پبلشنگ ہاؤس" میں جا پہنچے۔ ان کے دفتر میں داخل ہونے کی دیر تھی کہ نوجوان پروپرائٹر نے تیزی سے مصافحہ کرتے ہوئے جلدی سے پوچھا "فرمائیے کیسے آنا ہوا؟"

"ایک ناول لکھا ہے"

"دکھائیے" نوجوان پروپرائٹر نے جلدی سے مسودہ کو ہاتھ میں لیا اور ہاتھ ہی ہاتھ میں اس کے وزن کا اندازہ کیا۔ دو تین بار اسے اچھالا اور پھر مسودے کو سونگھنے لگا۔

"کیا سونگھ رہے ہیں" ہم نے حیران ہو کر پوچھا۔ نوجوان پروپرائٹر

نے جواب دیا "یوں تو میں عمر میں چھوٹا ہوں مگر اس لائن میں میرا تجربہ بہت زیادہ ہے۔ میں کتاب کو سونگھ کر ہی اندازہ لگا لیتا ہوں کہ وہ کیسی ہے۔"

"واہ بہت خوب!! ہم نے اس کے تجربے کی داد دی۔

"اس کی کوئی ضرورت نہیں"۔ نوجوان بولا "اب آپ داد دینے میں مزید وقت ضائع کئے بغیر ناول کے معاوضے کا فیصلہ کرلیں۔ کیونکہ ہمارا اصول ہے کہ ہم جو کام بھی کرتے ہیں۔ جلدی سے جلدی کرتے ہیں۔ اسی لئے ہم نے اپنے ناشر خانہ کا نام جھٹ پٹ پبلشنگ ہاؤس رکھا ہوا ہے۔

"صاحب آپ ہی بتا دیجئے۔" "آپ بھلا کم تھوڑا دیں گے۔ آپ...."

"دیکھئے آپ پھر اس آپ آپ کے تکلفات میں پڑ گئے۔ جو کام بھی کرنا ہو اسے جھٹ پٹ کر دیجئے۔ سو لیجئے آپکو پچاس روپے منظور ہیں ہاں۔"

"یہ تو بہت تھوڑے ہیں۔ لکھنے میں ہمیں ڈیڑھ سال لگا کر...."

"معاف کیجئے گا۔ آپ کے ساتھ ہمارا سلسلہ نہیں ہو سکتا۔ آپ تشریف لے جا سکتے ہیں" نوجوان بیزاری سے بولا۔

آخر ہمیں پچاس روپے بھی منظور کرلینے پڑے۔ نوجوان پبلشر نے دوسرے ہی لمحے اگریمنٹ پہ دستخط کروائے اور جھٹ سے دس دس کے پانچ نوٹ ہمیں دے دیئے۔ یہ سارا سودا کچھ منٹوں میں طے ہو گیا۔ "واقعی جھٹ پٹ پبلشنگ ہاؤس" والے کام کرنے میں بڑے تیز نکلے۔

ہم گھر واپس آتے ہوئے پچاس روپے کے اس بڑے نامعاوضے کی بابت سوچ رہے تھے۔ تبھی یہ شک ہو رہا تھا کہ نہ دستخط ادیب کا ملی تو محض بزی

لکھتے ہیں۔ ادب کمان کا سائیڈ بزنس ہے۔ وہ ضرور کہیں نہ کہیں نقب
لگا کر یا ڈاکہ ڈال کر اپنا گذارہ کرتے ہوں گے!..

اشتہاری خریداری

میں کسی شخص کے عقل مند یا بیوقوف ہونے کا اندازہ صرف ایک سوال پوچھ کر ہی لگا سکتا ہوں۔ میرا یہ سوال ایک ایسی کسوٹی ہے جس نے مجھے آج تک ایک دفعہ بھی دھوکا نہیں دیا۔ لیجئے اس پُر اسرار سوال کو آپ بھی سنئے اور آج ہی اپنے دوستوں۔ واقفکاروں اور رشتے داروں کی عقل کا امتحان لیجئے۔ جس کسی شخص کو آزمانا مقصود ہو۔ اُسے یہ سوال پوچھئے۔ کیوں صاحب کیا آپ اخباروں۔ رسالوں۔ ڈائریوں اور جنتریوں وغیرہ میں مشتہر شدہ چیزوں کو خریدتے ہیں؟ اگر تو وہ "نفی" میں جواب دے تب تو اُس کا دماغ صحیح سمجھئے اور اگر وہ "ہاں" میں جواب دے تو آپ مزید پوچھ تاچھ کئے بغیر ہی اُسے ٹکسالی بیوقوف

ہونے کا فتویٰ دے دیجئے۔ میرا یہ سوال کوئی الہامیہ نہیں بلکہ یہ میرے اُس تجربے کا نتیجہ ہے جو میں نے ہزاروں روپے برباد کرکے سیکھا ہے۔ ثبوت کے طور پر میں اپنی ٹھیک ([illegible]) بیوقوفی کی چند روشن مثالیں پیش کرسکتا ہوں۔

پہلا واقعہ تو میری عمر کے اُس حصّے سے تعلق رکھتا ہے جسے لوگ اٹھتی جوانی کے نام سے پکارتے ہیں۔ نئی نئی جوانی تھی اس وقت جنسی جذبات کو بھڑکانے والے ناول اور فلمیں جلتی پہ تیل چھڑکتے تھے ہر ایک فلم میں ہیرو اور ہیروئن کے درمیان محبت کے دلچسپ کھیل کو دیکھ کر میرا دل بھی بے اختیار یہی چاہتا تھا کہ اگر زیادہ نہیں تو کم از کم ایک لڑکی تو ایسی ملنی چاہیئے جسے میری محبوبہ ہونے کا فخر حاصل ہو۔ فلمی ہیرو کی طرح میں نے بھی کئی لڑکیوں کے آگے جان بوجھ کر اپنے رومال گرائے یا ان سے ٹکرا کر ان کی کتابیں زمین پر گرائیں۔ مگر افسوس نہ تو کسی لڑکی نے مجھے رومال ہی اُٹھا کر دیا اور نہ ہی مجھ سے کتابیں اُٹھوا کر واپس لینے کے بعد محبت بھری نظروں سے دیکھ کر "تھینک یو" ہی کہا۔ اُلٹا کئی لڑکیوں نے قہر آلود نظروں سے گھور کر سینڈلوں سے خاطر تواضع کرنے کا اشارہ ضرور کیا۔ کئی دفعہ قصداً اپنی سائیکل اُن کی سائیکلوں سے ٹکرائی مگر کچھ بھی ہاتھ پلّے نہ پڑا۔ اب تو صرف ایک ہی فلمی طریقہ آزمانے کے لئے باقی رہ گیا تھا۔ وہ یہ کہ کسی حسینہ کو کار میں آتا ہوا دیکھ کر اس کی کار کے نیچے آجاؤں تاکہ وہ مجھے اُٹھا کر اپنے گھر لے جائے اور اپنی قمیض یا اوڑھنی یا دوپٹے کا ایک کنارا پھاڑ کر میرے مرہم پٹی کرے اور میری بیہوشی دُور ہونے کے وقت تک نہایت ہی بیقراری سے

گھٹن کی سینکڑے دلم کی طرح سیر سے آدرد گرد منڈلاتی رہتی ہے۔ چونکہ یہ طریقہ خلاف یک تھا اس لئے اس پر عمل کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ حبیب میں ہر طرف سے مایوس ہو گیا تو خوش قسمتی یا بد قسمتی سے ایک رسالے میں مندرجہ ذیل اشتہار پر نظر پڑی ہے۔ براہ مہربانی اس کو نہ پڑھیں۔ اگر پڑھیں تو فائدہ اٹھائیں۔

منمو ہنی سینٹ

عاشقوں کیلئے ایک نادر تحفہ

قارئین۔ اگر آپ محبت میں چاروں طرف سے مایوس ہو چکے ہیں اور کوئی امید بر نہیں آتی" جیسے حالات سے تنگ آکر خودکشی کرنے پر آمادہ ہیں تو مرنے سے پہلے ہمارے لاجواب اور کراماتی "منموہنی سینٹ" کو ضرور آزمائیے ہمارا یہ سینٹ کوئی بازاری عطر نہیں بلکہ ہمارے بزرگوں کی مسلسل خدمات کا نتیجہ ہے جو انہوں نے۔ ایک ہنچے ہوئے سنیاسی کی ہتھیں سالہ تقریب سینٹ کی مدہوش کرنے والی خوشبو کو سونگھتے ہی آپ کا محبوب آپ سے ملنے کے لئے بیتاب ہو جائے آپ کی طرح بیقرار ہو کر بے بس آپ کے قدموں میں حاضر ہو جائے گا۔ ایک شیشی کی اصل قیمت ایک سو روپیہ ہے لیکن مشہوری کی خاطر اس رعایت کا جلد از جلد فائدہ اٹھائیے تاکہ بعد میں پچھتانا نہ پڑے"۔

یہ اشتہار پڑھتے ہی میری باچھیں کھل گئیں۔ فوراً ڈاک خانے پہنچ کر دس روپے کا منی آرڈر کروایا اور نہایت ہی بے قراری سے منموہنی سینٹ کے پارسل کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ جب تک یہ کراماتی سینٹ نہ آیا میں

دل ہی دل میں کئی قسم کے خیالی پلاؤ پکاتا رہا۔ کبھی یہ سوچتا کہ پہلے پہل تو یہ سینٹ
سونگھا کر اُن لڑکیوں سے جی بھر کر بدلہ لوں گا جو اس وقت اپنے حسن کے زعم میں اتنا
میری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتیں یا اگر غلطی سے دیکھ بھی لیں تو ایسا منہ
بناتی ہیں جیسے انہیں ابھی ابھی چھینک آنے ہی والی ہے۔ جب وہ اس عجیب و غریب
سینٹ کی خوشبو سے بیتاب ہو کر میرے قدموں میں حاضر ہوں گی تو میں انہیں نہایت
ہی نفرت سے ٹھکرا کر کہہ دوں گا "چلی جاؤ یہاں سے۔ میرے پاس اتنا وقت
نہیں ہے کہ تمہارے جیسی آوارہ لڑکیوں کی بات سن سکوں"۔ اور کبھی میں یہ سوچتا
کہ سیدھا بمبئی چلا جاؤں گا اور وہاں اپنی دل پسند ایکٹریسوں کو یہ سینٹ سونگھا
کر اپنا شیدائی بنا لوں گا۔ خوب مزے میں زندگی گزرے گی۔ اگر مدھو بالا میرے پاؤں
دبائے گی تو نرگس میرے دل کی آگ کو بجھانے کے لئے نہایت ہی دلفریب انداز
میں پنکھا کیا کرے گی۔ اگر شکیلہ مجھے پریم کے جھولے جھولایا کرے گی
تو آشا پاریکھ اپنی کیف آور نگاہوں کی مستی سے مسرور کر کے مجھے بے خودی کے
افسانے سنایا کرے گی۔ وجینتی مالا اپنے دلکش ناچ سے اور ثریا اپنی مسحور کن
آواز سے مجھے محظوظ کیا کرے گی۔

آخر وہ دن آ ہی گیا جب کا مجھے بڑی شدت سے انتظار تھا۔ ڈاکیہ آیا
اور چودہ آنے ڈاک خرچ کے لیکر سموہنی سینٹ کا پارسل میرے ہاتھوں میں تھما کر
رخصت ہو گیا۔ میں نے جلدی سے پارسل کھولا اور سموہنی سینٹ کی خوشنما
شیشی کو ہاتھ میں لیکر اسے جوشِ عقیدت سے چوم لیا۔ سموہنی سینٹ کو پاکر
میں اتنا خوش ہو رہا تھا جیسے میرے ہاتھ سینٹ کی شیشی نہیں بلکہ

البتہ دین کا چراغ آگیا ہے۔ میں نے کلاٹ سے نیا سوٹ پہنا اعداد پر اسرار سینٹ
کو رومال اور کوٹ کے کالر پر چھڑک کر فوراً کسی معشوق کی تلاش میں بازار کی طرف
نکل کھڑا ہوا خوش قسمتی سے جلد ہی ایک ایسی لڑکی مل گئی جو ایک عرصے سے میرے
خوابوں میں بسی ہوئی تھی اسے دیکھتے ہی میں نے جلدی سے رومال کو جیب سے نکال
کر ہاتھ میں لے لیا تاکہ اگر وہ کوٹ کے کالر سے منموہنی سینٹ کی خوشبو کو نہ سونگھ
سکے تو میں اپنے رومال کو اس کی ناک کے نزدیک لے جا کر اسے سونگھا دوں جب
وہ میرے نزدیک پہنچ گئی تو میں بھی اس کے راستے قریب سے گزرا کہ اس کا شانہ میرے
شانے سے ٹکرا گیا میں رومال کو بھی اس کی ناک کے نزدیک اس صفائی سے لے گیا کہ
اگر وہ اس واقعہ پر غور بھی کرتی تو یہی سمجھتی کہ اس سے میرا شانہ ٹکرانے پر گھبراہٹ
کی حالت میں یہ حرکت مجھ سے سرزد ہوئی ہے رومال کو اپنی ناک سے ٹکراتے ہی اس
نے ایک جھرجھری سی لی اور بے اختیار گرج کر بولی " یہ کیا بیہودگی ہے۔ اندھے ہو
گئے ہو کیا۔ دیکھ کر نہیں چلا جاتا " بازار میں کچھ ایسا سیدھا بکنے پر بے عزتی
ہونے کے ڈر کی اینٹ سمجھ کر میں نے چپکے سے اس سے معافی مانگی اور تھوڑی
دور آگے نکل کر ایک غیر آبادی سی گلی کے موڑ پر کھڑا ہو کر اس کے آنے کا انتظار
کرنے لگا کیونکہ سینٹ تو اس نے اچھی طرح سے سونگھ ہی لیا تھا۔ کوئی آدھ گھنٹہ ایڑیاں
اٹھا اٹھا کر میں اس کی راہ دیکھتا رہا لیکن وہ میرے پاس نہ پھٹکی جب اس کا انتظار
کرتے ہوئے چالیس پینتالیس منٹ گزر گئے تو اچانک ساتھ والے مکان کی دوسری
منزل کی ایک کھڑکی میں سے ایک شخص نے باہر جھانک کر مجھ سے یوں کہا " اتنی دیر
سے یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو۔ کیا کسی کا تالا توڑنے کا ارادہ ہے۔ بھاگ جاؤ"

یہاں سے دور دے میں ابھی نیچے اُتر کر تمہاری خبر لیتا ہوں"۔ یہ سن کر میں بہت کھسیانہ ہوا اور چپکے سے گھر واپس آگیا۔ کافی دیر تک یہ سوچتا رہا کہ وہ لڑکی میرے پاس کیوں نہیں آئی حالانکہ میں نے اُسے سینٹ اچھی طرح سے سونگھا دیا تھا۔ پھر یہ خیال آیا شاید یہ سینٹ کچھ کم لگا ہوگا۔ یہ سوچ کر میں نے منموہنی سینٹ کی پوری شیشی اپنے کپڑوں پر انڈیل لی اور دوبارہ کسی نئے شکار کی تلاش میں گھر سے باہر نکل پڑا۔ سینٹ کی خوشبو اتنی تیز تھی کہ میرا دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ بار بار کئی لڑکیوں کے آگے پیچھے منڈلاتا رہا مگر کسی نے بھی میرا نوٹس نہ لیا۔ آخر کار تھک ہار کر منموہنی سینٹ بنانے والوں کو گنی گنی تین وقتی گالیاں نکال کر کافی رات گئے گھر پہنچا اور بغیر کچھ کھائے پیئے ہی سو گیا۔ دوسرے دن مجھے کافی زور کا زکام ہو گیا (سینٹ کی تیز خوشبو کی وجہ سے) اور کئی دنوں تک میری طبعیت نہایت ہی خراب رہی۔ حسین لڑکیوں اور ایکٹرسوں کے دلوں کو موہنے کے رنگین خیال کے سنہری دھاگے ایک ایک کر کے بکھر گئے اور میں پہلے کی طرح غمگین اور مایوس سا رہنے لگا۔

کچھ دنوں کے بعد اخبار میں ایک اور اشتہار پر نظر پڑی جس کا مضمون حسب ذیل تھا۔

محبت کا سُرمہ

اس جادو بھرے محبت کے سُرمہ کو آنکھوں میں ڈال کر محبوب کے سامنے چلے جائیں تو وہ خواہ کیسا ہی پتھر دل کیوں نہ ہو فوراً اُس کا دل موم ہو جائیگا

آپ سے محبت کرنے لگا۔ آپ کے پاس کچے دھاگے سے بندھی آئیں گی میری سرکار گو والی کہاوت کے مصداق خود بخود کھنچا چلا آئے گا نیز تغیر تحفہ ہے پرچہ ترکیب ہمراہ ہوگا۔ جھوٹ نکلے تو قیمت فوراً واپس ہوگی دو ہی طلب کریں اس اشتہار نے میرے ڈوبتے ہوئے دل کو ڈھارس دی اور میں نے اس سرمہ کا بھی آرڈر دے دیا۔ سرمہ ملنے پر میں نے ساتھ والے پرچے پر لکھی ہوئی ترکیب کے مطابق ایک منتر پڑھ کر اس کی دو سلائیاں آنکھوں میں ڈالیں اور چھیلا بن کر اس کی کرامات آزمانے کے لئے گھر سے باہر نکل گیا مگر افسوس کوئی لڑکی بھی ٹس سے مس نہ ہوئی۔ انہوں نے مجھ پر دل تو کیا تھوکنا تھا الٹا اپنے تین تین ہیرو ہنڈا والے سینڈل مجھ پر ور کرنے کے خوفناک ارادے ضرور ظاہر کرنے لگیں۔ جس کسی نے بھی مجھے سرمہ ڈالے ہوئے دیکھا وہی بے اختیار ہنسنے لگا کیونکہ اس سے پہلے کسی نے کبھی بھی میری آنکھوں میں سرمہ نہیں دیکھا تھا۔ کچھ دن بعد تنگ آکر میں نے سرمہ کی باقی ماندہ ساری شیشی اپنی آنکھوں میں جھونک لی تاکہ اگر اس میں کوئی کرامات ہے تو فوراً ظاہر ہو جائے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ پورا ایک مہینہ میری آنکھوں پہ پٹی بندھی رہی اور میری نظر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کمزور ہو گئی۔ محبت کے اس سرمہ نے میری آرزوؤں کا بھی سرمہ ہی بنا دیا۔

اس کے بعد میں نے شری سوامی گمت نراین جیوتشی آشرم والوں کا منہ مانگی وشی کرن جنتر منگوا کر بھی کئی مہینے اپنے دائیں بازو سے باندھ رکھا مگر افسوس کوئی بھی حسینہ میرے سنسان پہلو کی رونق نہ ہو سکی۔ میں نے

کافی عرصہ تک مال مسمریزم ہاؤس سے پروفیسر صاحب کی "طلسمی انگوٹھی" بھی اپنے ہاتھ میں پہن رکھی مگر وہ بھی کسی لڑکی کو میرے نزدیک لانے میں کامیاب ثابت نہ ہوئی حالانکہ اس انگوٹھی کی بابت پروفیسر صاحب نے یہاں تک لکھا تھا کہ یہ انگوٹھی جو مسمریزم کے طریقہ پر حال ہی میں ایجاد ہوئی ہے اس کو حسب ہدایت استعمال کرنے سے مردہ روحوں سے ملاقات، گمشدہ چیزوں کا پتہ، دور پردیس میں گئے ہوئے دوستوں اور رشتہ داروں سے بات چیت مقدمہ و امتحان میں کامیابی اور عمدہ نوکری کا ملنا۔ محبوب کو قابو میں کرنا۔ بہت ممکن اور آسان ہو جاتا ہے۔ افسوس کوئی بھی سینٹ، سرمہ، تعویز جنتر اور انگوٹھی وغیرہ میرے دل کی سونی دنیا کو آباد نہ کر سکی۔ الٹا اس کی ویرانی تنہائی اور اداسی پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ چکی ہے۔ اب میں [illegible] کبھی محبوب کو بس میں کرنے والی کسی چیز کے متعلق کوئی اشتہار پڑھتا ہوں تو چپکے سے اس کے مشتہر پر لاحول پڑھ کر خاموش ہو جاتا ہوں۔

محبوب کی محبت کی گارنٹی دینے والوں کے بعد میں امریکن پستول والوں کا نشانہ بنا۔ اپنے پستول کی بابت انہوں نے لکھا تھا۔ ہمارا پستول آپ کا بہترین محافظ اور مددگار ہے اسے ہاتھ میں لے کر آپ بلا خوف و خطر گھنے سے گھنے جنگلوں میں گھوم پھر سکتے ہیں۔ اس کا دھماکا سن کر خوفناک سے خوفناک جنگلی جانور بھی دم دبا کر بھاگ جاتے ہیں۔ چور اور ڈاکوؤں کے چھکے چھوٹ جاتے ہیں اور ہمارے ڈر کے انہیں ہچکیاں

آف شروع ہو جاتی ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہ کرامات پستول کے لئے گورنمنٹ سے کسی قسم کا لائسنس نہیں لینا پڑتا۔" جب میں نے اُن کو پستول منگوانے کے بعد اُسے "آزمانے" کے لئے اپنے گھر میں انیوالی شریر بلی پر فائر کیا تو میری حیرانی کی کوئی حد نہ رہی۔ فائر کے دھماکے سے "ڈر کر بھاگنے" کی بجائے یہ شریر کی ماسی (بلی) اُلٹا مجھے چیر پھاڑ کر۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے خونخوار ہوتی ہوئی مجھ پر حملہ آور ہو گئی۔ دہشت کے مارے پستول میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور میں نے بھاگ کر اپنے کمرے میں داخل ہونے کے بعد دروازے کو بند کر کے جان بچائی۔ اس واقعہ کے بعد میرا انتخاب "مانس" نتیجہ اِسی خوفناک ہتھیار سے بلا وجہ خطرہ دیتا رہتا ہے۔

امریکن پستول کے بعد پیرس ناولٹی واچ کمپنی والوں نے میری عقل کا مزید امتحان لیا۔ انہوں نے اپنے اشتہار میں لکھا تھا "اپنی فرم کی مشہوری کی خاطر ہم ایک ہزار گھڑیاں صرف پانچ روپے فی گھڑی کے حساب سے دیں گے۔ ہماری ان گھڑیوں کی خوبصورتی اور پائیداری کی گارنٹی پانچ سال ہے۔" جب اُن کی گھڑی میرے ہاتھوں میں پہنچی تو میرے دل کی حرکت بند ہوتے ہوتے ہی رہ گئی۔ ان کی یہ گھڑی بازار میں ایک ایک آنے میں بکنے والی بچوں کی گھڑیوں کی مانند کسی قسم کی مشینری کے بغیر ہی تھی۔ ہاں البتہ "خوبصورتی اور پائیداری" میں وہ ایک آنے والی گھڑی سے کہیں زیادہ دیدہ زیب اور مضبوط تھی۔ "پیرس ناولٹی واچ کمپنی" والے زبان کے کتنے سچے نکلے۔

میری معصومیت اور سادہ لوحی کی داد دیجئے کہ پستول اور

گھڑی کی خریداری کے بعد بھی میں اخباری اشتہار بازوں کی رنگا رنگ دلفریب
اور عقل کو زنگ لگا دینے والی عبارتیں پڑھ پڑھ کر کئی قسم کے کیمرے، دوربین
کی عینکیں اور فاؤنٹین پین وغیرہ خریدتا رہا۔ جب یہ لٹیرے جی بھر کے مجھے
اُلّو بنا چکے تو مجھے بھی عقل آ گئی۔ واقعی انسان تجربے کے بعد ہی کچھ سیکھتا ہے
اسی مہنگے تجربے نے ہی مجھے کسی کی عقل کا امتحان لینے کے لئے یہ سوال پوچھنے
کے قابل بنا دیا ہے کہ کیوں صاحب! کیا آپ اخباروں، رسالوں، جنتریوں اور
ڈائریوں وغیرہ میں مشتہر شدہ چیزوں کو خریدتے ہیں؟

ایک ہندوستانی مہاراجہ کے نام کھلا خط

بخدمت حضور فیض گنجور ہز ہائی نس مہاراجہ گرو دہ صاحب بہادر جی۔ او۔ ای

سی۔ ایس۔ آئی۔ آر جی ڈبلیو ڈی سی۔ بی ڈی۔ ایم۔ ٹی وغیرہ وغیرہ

بندہ نہایت ہی ادب سے فرشی سلام بجا لانے کے بعد عرض کرتا ہے کہ خدا آپ کے
اقبال کے ڈنکے بجتے ہوئے سورج کو ہندوستان میں وسیع پیمانے پر پھیلی ہوئی بیکاری اور
رشوت ستانی کی طرح دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی دے۔ کل اخبار میں پڑھا تھا
کہ اپنے ملک کو آزادی ملنے کے بعد آپ کے دشمنوں کی طبیعت اکثر دیگر مہاراجاؤں کی
طرح ناساز رہتی ہے اور آپ بھی صحت کی خاطر سوئٹزرلینڈ میں مقیم ہیں۔
یہ آپ نے بہت ہی اچھا کیا جو اپنی گرتی ہوئی صحت کو بنانے کی خاطر ملک سے باہر تشریف
لے گئے۔ کیونکہ حصولِ آزادی کے بعد ہندوستان کی آب و ہوا میں حقیقۃً ایک ایسے
خطرناک جراثیم پیدا ہو چکے ہیں جو آپ ایسے شاہانہ اور نازک مزاج لوگوں

کی طبیعت کے لئے نہایت ہی نقصان دہ ہیں۔ مطلب یہ میں سمجھتا ہوں کہ انگریزوں
کے جانے کے بعد آپ کی رنگین طبع کے لئے کوئی موزوں سوسائٹی ہی نہیں رہی
۔ انگریزی راج کی بہاریں ہی اور تھیں۔ رنگ رنگ کی محفلیں ۔ کاک ٹیل پارٹیاں
شادی اور سیر و تفریح کے پروگرام تو اب ایک خواب بن کے رہ گئے ہیں ۔ شاہی وقار
اور رعب والے سے عوام اب بالکل مرعوب نہیں ہوتے ۔ کیونکہ چند سرپھرے
لیڈروں نے کہیں سے ان کے دماغ میں یہ غلط اور لغو خیال ٹھونس دیا ہے
کہ رجواڑوں اور عوام کے درمیان حیثیت کے لحاظ سے اب کوئی بنیادی فرق
نہیں ہونا چاہیے ۔ حکمرانوں اور رعایا کے درمیان صدیوں پرانا رشتہ
توڑ کر سب کو یکساں شہری حقوق ملنے چاہییں ۔ رگتہ بھی صاحب لوگ تو یہاں
تک کہتے ہیں کہ حکومت کو آپ کی تمام جاگیریں چھین لینی چاہییں ۔ اور تو اور آپ
کا پریوی پرس اور دیگر الاؤنس و مراعات بھی بند کردینی چاہییں ۔ خدا کی
پناہ ۔ وہ تو آپ کو سفید ہاتھی کہنے سے بھی نہیں جھجکتے ۔ لاحول ولا قوۃ
کیسا الٹا زمانہ آگیا ہے ۔ خیر کچھ بھی ان لوگوں کو جب تک موجودہ حکومت
برداشت ہے آپ کو ایسے گذیارگوں کے بیکار نعروں کی چنداں پرواہ نہیں
کرنی چاہیے ۔ پتہ نہیں یہ کس قماش کے لوگ ہیں کہ آپ سے حکومت
کے اختیارات چھین کر ان کی نیت نہیں بھری جو اب یہ آپ کی جاگیروں محلوں
اور دیگر الاؤنسوں کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے ہوئے ہیں ۔ کسی نے سچ
ہی کہا ہے کہ لالچی آدمی سے خدا بچائے ۔

نمبر ۲ نصیحت ۔ اگر آپ برا نہ منائیں تو ایک عرض کروں ۔ کیوں نہیں آپ

اپنی جاگیروں۔ محلوں اور دیگر ساز و سامان کو فروخت کر کے مستقل طور پر یورپ یا امریکہ میں بس جاتے ..... اگر آپ ہندوستان میں رہیں گے ۔ تو مندرجہ بالا بیہودہ نعروں کی گونج آپ کے کانوں کے نازک پردوں سے ٹکرا ٹکرا کر آپ کی نرم و نازک طبیعت پر ایک گراں بوجھ بن کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آپ کی صحت کا ستیاناس کر ڈالے گی اور پھر یورپ تو کیا دنیا کے کسی بھی قابل سے قابل ڈاکٹر کے سنبھالے نہ سنبھلے گی ۔۔ ہندوستان کبھی اب کوئی رہنے کے قابل ملک رہ گیا ہے نہیں کیسے کیسے خشک اور زاہد مزاج لوگوں کے ہاتھ حکومت کی باگ ڈور آگئی ہے جگہ جگہ شراب بندی جیسے "بیہودہ" قانون نافذ ہو رہے ہیں ۔ بھلا شراب کے بغیر زندگی بھی کوئی زندگی ہے ۔ میں تو ایسی زندگی کو زندگی نہیں بلکہ شرمندگی سمجھتا ہوں ۔ مجھے پختہ یقین ہے کہ آپ ہندو کی اس رائے سے پوری طرح متفق ہوں گے ۔ خدا نے جو آپ کو بے پناہ دولت بخشی ہوئی ہے اس کا جائز اور معقول ترین استعمال صرف یورپ یا امریکہ میں ہی ہو سکتا ہے غریب ہندوستانی نہ تو خود عیش کر سکتے ہیں اور نہ آپ ایسے دولتمند لوگوں کو بھی عیش کرتے ہوئے دیکھ سکتے ہیں ۔ اگر آپ ہندوستان میں رہے تو مجھے ڈر ہے کہ آپ کی گزری ہوئی شان و شوکت کے ساتھ ساتھ کہیں اپنے بزرگوں کی خون پسینہ ایک کر کے جوڑی ہوئی بے اندازہ دولت جاگیروں ۔ محلوں ۔ ہیرے جواہرات ۔ چمکتی دمکتی موٹر کاروں ۔ نوکر چاکروں اور خوبصورت خادماؤں سے بھی ہاتھ نہ دھونے پڑیں ۔ زمانے کی ہوا ایسی بتا رہی ہے کہ آپ کی شاہانہ کر و فر اور دبدبہ صرف چند روز کے مہمان

[illegible]۔ اگرچہ آپ ایسے لوگوں کی ہندوستان سے کوچ کر جانے کی خبر میرے لئے ایک خوفناک حادثہ سے کم نہ ہوگی۔ لیکن پھر بھی میں آپ کی جان و مال کی سلامتی کی خاطر یہ عظیم صدمہ ہنستے ہنستے برداشت کر لوں گا۔ اپنے دل پر پتھر رکھ کر آپ کی جدائی کا غم سہہ لوں گا۔ آپ کے ہجر میں جل جاؤں گا لیکن اف تک نہ کروں گا۔ میں نہیں چاہتا کہ رجواڑہ شاہی کے ٹوٹتے ہوئے ستونوں کو اپنی ہی زندگی میں اپنی ہی آنکھوں کے سامنے گرتے ہوئے دیکھوں۔ اگر آپ اپنی خاطر نہیں تو کم از کم مجھ ایسے قدر دانوں کا دل رکھنے کے لئے ہی جلد از جلد مسند چھوڑ دیں۔

یور ہائی نس میں آپ کو پختہ یقین دلاتا ہوں کہ دس پندرہ سال کے بعد یا میری زندگی میں جب کبھی آپ پرانی یادوں کو تازہ کرنے کے لئے ہندوستان تشریف لایا کریں گے تو میں بمبئی میں گیٹ وے آف انڈیا کے تاریخی مقام پر آپ کا پرجوش استقبال کیا کروں گا۔ اگرچہ مجھ ایسے غریب آدمی کے پاس آپ کو سلامی دینے کے لئے توپیں تو نہ ہوں گی پھر بھی آپ کی عزت افزائی کی رسم کو پورا کرنے کے لئے چھ آنے درجن والے اکیس پٹاخے چلا کر آپ کو خوش آمدید کہا کروں گا۔

حضور والا! اگر جان کی امان پاؤں تو ایک عرض اور کروں۔ امید ہے کہ آپ اسے ایجی ٹیشن میں گستاخی تصور نہ کرتے ہوئے نہایت ہی ٹھنڈے دل سے اس پر غور فرمائیں گے۔ عرض یہ ہے کہ جب آپ ہندوستانیوں کو داغ مفارقت دے جائیں گے تو آخر کار ایک ایسا وقت بھی آ سکتا ہے کہ ہم آپ لوگوں کو بالکل ہی بھول جائیں۔ خدانخواستہ اگر ایسا ہو گیا تو رجواڑہ شاہی

کے لئے اس سے بڑھ کر خوفناک ٹریجیڈی اور کیا ہو گی۔ کئی سالوں سے یہ وحشتناک
خیال میرے دل و دماغ کو بُری طرح سے پریشان کر رہا تھا۔ مگر آپ کو یہ سُن کر ازحد
مسرت ہو گی کہ حال ہی میں میں نے اس اُلجھن پر قابو پا لیا ہے اور آپ کے نام و نشان
کو زندہ جاوید رکھنے کے لئے ایک پلان مرتب کر لیا ہے۔ وہ پلان یہ ہے کہ جب
عیش و عشرت کی قابلِ رشک زندگی بسر کر چکنے کے بعد آپ عمر رسیدہ ہو کر
دوسرے جہان کو کوچ کر جانے کی تیاری فرما رہے ہوں تو مندرجہ ذیل وصیت
کر جائیں۔

"میں مہاراجہ گرمیدہ بقائمی ہوش و حواس یہ وصیت کرتا ہوں کہ میری وفات
کے بعد میری لاش کو مصر کے قدیم بادشاہوں کی لاشوں کی طرح خراب نہ ہونے والے
مصالحوں سے بھر کر پوری حفاظت سے کلکتہ کے عجائب گھر میں رکھ دیا جائے تاکہ اسے
دیکھ کر موجودہ یا آنے والی نسلیں یہ اندازہ لگا سکیں کہ مہاراجہ لوگ کیسے ہوتے
تھے۔ اُن کی شکل و صورت اور لباس کیسا ہوتا تھا وغیرہ وغیرہ۔ میں
اپنے دیگر حکمران بھائیوں کو بھی یہی مشورہ دیتا ہوں کہ وہ بھی میرے نقشِ
قدم پر چلتے ہوئے اپنی لاشوں کو دنیا کے مختلف عجائب گھروں میں پوری
پوری حفاظت سے رکھے جانے کی بابت وصیت کر جائیں اور ساتھ ہی ساتھ
اپنے بزرگوں کے حالاتِ زندگی بھی لکھا کر رکھ جائیں تاکہ تاریخ نویسوں
کو ان کے حالات کی ریسرچ کرتے وقت زیادہ مغز کھپائی نہ کرنی پڑے
اور وہ آسانی سے اُن کی زندگیوں پر روشنی ڈال سکیں"!

کہئے مہاراجہ صاحب۔ پسند آیا نا میرا پلان؟ اوہو۔ آپ تو

کافی سے زیادہ خوش دکھائی دے رہے ہیں۔ کیوں نہیں! کیوں نہیں!! بات ہی خوشی کی ہے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کسی انسان کے لئے اس سے بڑھ کر شاید ہی خوشی کی کوئی اور بات ہوتی ہو کہ مرنے کے بعد بھی اس کا نام زندہ رہے گا۔ اچھا تو حضور اسی خوشی میں ہم پر بھی کچھ نظرِ عنایت ہو جائے۔ سنا ہے کہ یور ہائی نس اپنے بزرگان عالی نسب کی طرح فیاض اور دریا دل ہیں ۔۔۔۔۔۔ دریا دل ہی نہیں بلکہ سمندر دل ہیں جب کسی پر خوش ہو جاتے ہیں تو یہ بھی نہیں سوچتے کہ بخششوں کے بھاری بوجھ سے کہیں انعام پانے والے کی کمر ہی نہ ٹوٹ جائے۔ لیکن حضور یقین فرمائیں کہ اس معاملے میں میری کمر کافی مضبوط ہے مگر رونا اس بات کا ہے کہ ابھی تک کوئی کمر توڑنے والا ہی نہیں ملا۔ ایک گمنام سا ادیب ہوں اور دیگر ادیبوں کی طرح اپنے ملک کے ناشروں اور اخبارات و رسالوں کے مالکوں کے ہاتھوں سخت نالاں ہوں لکھنے کے لئے فرمائشوں پر فرمائش بھیجتے ہیں لیکن جب معاوضے کی ادائیگی کا وقت آتا ہے۔ تو بچوں کی مانند ٹھٹھا کر دانت نکال دیتے ہیں۔ اگر کچھ دیتے بھی ہیں تو صرف آنسو پونچھنے کے لئے۔ ان کے معاوضہ کی رقم اتنی مختصر ہوتی ہے کہ دینے والے کی نسبت لینے والے کو کہیں زیادہ شرم آ جاتی ہے۔ شاید ان لوگوں کا خیال ہے کہ شاعر اور افسانہ نگار جسمانی خوراک کی بجائے روحانیت کے وٹامن چبا چبا کر زندہ رہتے ہیں اور ادبی شہکاروں کی جگالی کرتے رہتے ہیں۔ یور ہائی نس میں آپ کو پختہ یقین دلاتا ہوں کہ اگر آپ نے بندہ کو ایک دفعہ بھی خوش کر دیا تو آپ کی اور آپ کے عالی وقار آباؤ اجداد کی شان

میں ایسے ایسے قصیدے تحریر کرونگا۔ کہ آپ تو کیا آپ کے بزرگوں کی روحیں
بھی وجد میں آکر بھگوان شو جی کے تانڈو ناچ کا مظاہرہ کرنا شروع کر دیں گی

امید کرتا ہوں کہ اس صحت افزا خط کو پڑھکر آپ کی ناساز
طبیعت پر کافی خوشگوار اثر پڑے گا اور آپ واپسی ڈاک اپنے سیکریٹری
سے مجھے جرمانہ اور انعام دونوں بھجوانے کی تکلیف گوارا فرمائیں گے۔

دیگر ہندوستانی بھائیوں کے ساتھ تازندگی آپ کی تکلیف گوارا فرمائیں۔ مندد
اپنے دیگر ہندوستانی بھائیوں کے ساتھ تا زندگی آپ کی جان و مال کی
دعائیں دیتا رہے گا۔

میں ہوں آپ کا خیر خواہ

ا. ج. ص.

معمّا بازی سے معمّہ سازی تک

آج سے تین سال پیشتر میں دنیا کا سب سے زیادہ بیوقوف انسان تھا
مجھ سے زیادہ جاہل، خر دماغ اور بھوندا انسان دن کو چراغ لیکر ڈھونڈنے
سے بھی نہیں مل سکتا تھا۔ بیوقوفی اور جہالت کی دیوی بعض اوقات مجھے دیکھ
کر مارے شرم کے اپنا منہ چھپا لیتی کیونکہ کند ذہنی اور خر دماغی میں میں اس
سے بدرجہا بہتر تھا۔ عقل اور سمجھ بوجھ سے مجھے خدا واسطے کا بیر تھا۔ دانشمندی
اور فہم و فراست میری دشمن نمبر ایک تھیں۔ مگر کیوں؟ .... میں اتنا
"یعنی بُوا" بیوقوف کیوں تھا۔ میں نے اپنے دماغ میں سے عقل کو لاٹھیاں مار مار کر
کیوں بھگا دیا تھا .... اسے گھاس چرنے کے لیے کیوں کھلا چھوڑ
دیا تھا۔ کیا مجھے مالیخولیا ہو گیا تھا؟ .... جی نہیں +
تو پھر کیا وجہ تھی۔ کہ میں فسٹ کلاس قسم کا بیوقوف بن گیا۔ یوں ہے

نے تسعامپ کے تمام سابقہ ریکارڈ توڑ دیئے؟

میں نے احمق پن کی ناقابلِ تسخیر۔ دشوار گزار الجھیلینہ چوٹی کو کیسے فتح کر لیا؟

آخر میری اس ہمہ گیر اور بین الاقوامی جہالت کی وجہ کیا تھی؟

ان سب باتوں کا جواب صرف ایک لفظ میں چھپا ہوا ہے۔.........

اور وہ لفظ ہے "معمّہ بازی"، جس کا مطلب ہے معمّے حل کرنا۔ جی ہاں۔......

.... میں معمّے حل کیا کرتا تھا۔...   ....اور وہ بھی ہندوستانی اخبارات اور رسالوں کے! ان اخباروں اور رسالوں کے معمّے جو کہ ہر ماہ لاکھوں روپے کے نقد انعامات (جن کی مجموعی تعداد کروڑوں روپوں تک جا پہنچتی ہے۔) اپنے بھولے بھالے غریب قارئین کے درمیان ان کی دماغی اور مالی حالت "سدھارنے" کے لئے تقسیم کرنا اپنا ایمان خیال کرتے ہیں۔ جب میں نے پہلے پہل معمّے حل کرنے شروع کئے تھے۔ تو میرا خیال تھا کہ سب ہندوستانیوں کو ان اخباروں اور رسالوں کے مالکوں کی اس فیاضانہ قومی اور ملکی خدمت کے لئے تہِ دل سے مشکور و ممنون ہونا چاہیئے اور اگر ہو سکے تو ان کے سامنے سجدہ بجا لانے سے احتراز نہیں کرنا چاہیئے۔ بے چارے کس طرح دونوں ہاتھ بھر بھر کر اپنی دولت "لٹا" رہے ہیں۔ ہر ماہ انعامات کی رقموں کو دوگنا اور چوگنا کرتے رہتے ہیں۔ عوام کی دماغی اور مالی خدمت کا تو انہوں نے بیڑا اٹھایا ہوا ہے۔ پتہ نہیں بے چارے کہاں کہاں سے ملت اکٹھی کر لاتے ہیں۔ اور ہر ماہ اپنے معمّہ باز قارئین کی جیبوں میں زبردستی ٹھونس دیتے ہیں۔ اسے سمجھتے ہیں خدمتِ خلق کا بے غرضانہ جذبہ اور بے لوث محبت

شاید آپ کو یہ سن کر غش آجائے کہ کئی ایک اخبار اور رسالے ایسے بھی ہیں کہ
اگر ان کے کرائے کے دفتر میں اُن کے سارے فرنیچر، سٹیشنری اور دیگر اہم
غلط اشیاء کو اکٹھا کر کے نیلام کیا جائے تو ان کی مجموعی قیمت پانچ سو روپے سے
زیادہ نہ ہوگی۔ مگر حیرانی اس بات پر ہے کہ وہ ہر ماہ باقاعدہ سینکڑوں بلکہ ہزار
روپے کے نقد انعامات بغیر کسی قسم کی تاخیر کے نہایت ہی "ایمانداری" سے
تقسیم کرتے ہیں۔ پتہ نہیں بیچارے کہاں کہاں "ڈاکے مار کر" اپنے پڑھنے
والوں کے لئے روپے کا اتنا معقول انتظام کرتے ہیں۔ خُدا ان کو اس نیک
کمائی میں برکت دے!

ہاں تو میں مبتلا رہا تھا کہ میری اس عظیم الشان بے وقوفی کا آغاز معمّے
بازی کی بدولت ہوا۔ معمّے حل کرنے کے شغل کو میں نئے دولت مند بننے کا
سب سے آسان ذریعہ سمجھتا تھا۔ معمّہ سازوں کے لاکھوں روپے کے نقد انعامات
کی تفاصیل پڑھ کر میری آنکھیں چندھیا اُٹھتی تھیں۔ اگر کسی معمّے کا پہلا انعام
ایک لاکھ روپے کا ہوتا اور میں اسے حل کر کے بھیجتا تو جب تک اس کا صحیح حل
شائع نہ ہو جاتا۔ تب تک میں اُس ایک لاکھ روپے کی گراں قدر رقم کو خرچ کرنے
کے بہترین طریقے سوچتا رہتا۔ میں سوچتا کہ انعام آتے ہی میں اپنے مکان کو چھوڑ کر
امریکن طرز کی نئی کوٹھی میں جا بسوں گا۔ سواری کے لئے "بیوک" رکھوں گا۔ گرمیوں
کا "ایئر" معمّے باز موسم شہر کی جھلسا دینے والی لُو اور گرمی سے دُور کسی
صحت افزا مقام کی حسین اور رنگین فضاؤں میں گزارا کروں گا۔ سچ پوچھو تو میں ہندوستان
کے پہاڑی مقامات کی خوب سیر کرنا چاہتا تھا جو گرمی مٹانے کے لئے "ٹھنڈا" خیال

کرتا تھا اس وقت میں معمولی ٹیرز رلنیٹ کے سوا کسی اور مسرت افزا مقام پر جانا باعث توہین سمجھتا تھا۔ مگر جب معمے کا صحیح حل شائع ہوتا۔ تو مجھے سانپ سونگھ جاتا۔ ایسے محسوس ہوتا جیسے کسی نے کوہ ہمالیہ کو پورے زور سے اٹھا کر میرے سر پر پھینک دیا ہو۔ جو کوئی بھی مجھ سے بات کرتا میں اسے باؤلے کتے کی طرح کاٹنے کو دوڑتا۔ میری خیالی کوٹھی کی بنیادیں تاروں کے خزانے کی طرح زمین میں دھنس جاتیں اور "بیک سائڈ" انجن پوری رفتار سے میرے ارمانوں کو کچلتی ہوئی بدقسمتی کے گہرے گڑھے میں جا گرتی۔ معمہ نمبر رسیٹ ہو جاتا کہ نہ کتار میں اپنی طبیعت کی گرمی مٹانے کے لئے مکمنی بات ہی نہ جا سکتا۔ میرا حلیہ کچھ اس طرح بگڑ جاتا۔ کہ دیکھنے والا یہی سمجھتا کہ میں ابھی ابھی کسی عزیز کو کفنانے دفنانے سے فارغ ہوا ہوں۔ بعض دفعہ ایک معمے کا صحیح حل میری امیدوں کے "ہیروشیما" کے لئے ایٹم بم کا دھماکہ ثابت ہوتا۔ میں یہ عظیم صدمہ برداشت کرتا رہتا کہ آئندہ کوئی معمہ حل کر کے نہیں بھیجوں گا۔ مگر ابھی تو میری بے وقوفی کا آغاز ہی تھا۔ اگر میں اور معمے حل کر کے نہ بھیجتا تو بے وقوفوں کی تاریخ میں میرا نام سنہری حروف میں کیسے لکھا جاتا!

کہتے ہیں کہ وقت بڑے سے بڑے گھاؤ کو مندمل کر دیتا ہے۔ یہی حال میرا ہوا۔ پرانے صدمات کو بھول کر میں نئی امنگوں اور نئے ارادوں سے مسلح ہو کر نئے سرے سے معمہ بازی کے میدان میں ڈٹ جاتا۔ لیکن ایک حل بھیجنے کی بجائے سینکڑوں حل بھیجنے لگا۔ تاکہ پہلا انعام کسی دوسری طرف نہ کھسک سکے مگر صحیح حل شائع ہونے پر میرا حلیہ ایک دفعہ پھر ماتمی بن جاتا۔ ایسے محسوس ہوتا جیسے مجھے ابھی ابھی کئی ہزار وولٹ کا برقی کرنٹ چھو گیا ہو۔ امیدوں پر

اوس پڑ جاتی اور آرزوؤں پر اولے۔ تمناؤں کی لہلہاتی فصل کو ناکامیوں کا ٹڈی دل دیکھتے ہی دیکھتے چٹ کر جاتا۔

میں بے وقوفی کی منزلیں نہایت تیزی سے طے کر رہا تھا! ہر ناکامی مجھے سمند شوق کو نیا تازیانہ لگاتی میں نئے جوش اور ولولے کے ساتھ نئے معمے حل کر کے بھیجتا۔ ہر ایک اخبار اور رسالے کے معموں کے زیادہ سے زیادہ حل بھیجتا۔ تاکہ اگر پہلا انعام نہیں تو کم از کم سب سے زیادہ حل بھیجنے والا انعام تو مل جائے۔ پہلا انعام تو خیر کیا آنا تھا۔ زیادہ حل بھیجنے پر ملنے والے انعامات بھی اور ہی صاحبان لے جاتے۔ جو مجھ سے بھی زیادہ تیزی سے دولت مند بننے کے شوقین تھے۔

میں احمق پن کی سب سے بلند چوٹی سے صرف چند فٹ کے فاصلے پر ہی رہ گیا تھا!

میں اور بھی — سرگرمی سے زیادہ سے زیادہ حل بھیجنے لگا کسی قسم کا معمہ میں نے حل کرنے سے نہیں چھوڑا۔ کیا ادبی اور کیا تعمیری۔ کیا فلمی اور کیا معلوماتی۔ ہر قسم کی ڈکشنریاں برتیں اور معموں پر بحث کرنے والے مختلف رسالوں کے درمیان گھرا ہوا میں دماغ سوزی کرتا رہتا۔ سچ کہتا ہوں کہ جتنی محنت سے میں معمے حل کرتا تھا اگر اتنی ہی محنت سے کوئی ادبی ریسرچ کرتا تو ضرور ہی ڈاکٹر آف لٹریچر کی ڈگری حاصل کر لیتا۔ مگر افسوس پہلا انعام نہ آنا تھا نہ آیا۔ البتہ کبھی کبھار میرے زخموں پر نمک چھڑکنے کے لئے ڈیڑھ دو روپیہ کا چار خطوط والا انعام آ جاتا۔

جب میں نے سٹہ بازی شروع کی تھی اس وقت میرے پاس پندرہ ہزار روپے نقد تھے، بیس ہزار کاروبار میں لگے ہوئے تھے، اور پچیس ہزار روپے کی جائیداد تھی۔ یعنی میری مالی حیثیت تقریباً ساٹھ ہزار کی تھی مگر اب ساٹھ ہزار کی رقم کے آخری دو صفر اُڑ گئے تھے۔ یعنی صرف چھ سو روپیہ رہ گیا تھا۔ اپنا مکان بیچ کر جب یہ امریکن طرز کی کوٹھی میں جا بسنے کی بجائے کرائے کے ایک مکان تک گمشدہ ہی پہنچ گیا تھا۔ "بیوک" کی سیر کرنے کی بجائے اپنی "ریلے" کی سائیکل سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا۔ گرمیوں میں مجھے اب سوئٹزرلینڈ کی سیر کی بجائے گرمی اور لُو سے بچنے کے لئے ہندوستان کے کسی گھٹیا سے پہاڑی مقام پر جانے کی توفیق تک نہ ہوئی۔

آخر میں یہ چھ سو روپیہ بھی آخری داؤ پر لگا دیئے۔ مگر یہ بھی معمہ سازوں کی تجوریوں میں چلے گئے۔ میں پیسے پیسے کو محتاج ہو گیا۔ کاروں اور کوٹھیوں کے خواب دیکھتا دیکھتا جو دال روٹی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا تو میرے دماغ کے پینچ پرزے ڈھیلے ہو کر ... اپنی جگہ سے ہل گئے۔ دیانت دار معمہ سازوں نے میری مالی حالت تو پہلے ہی سدھار دی تھی مگر اب دماغی حالت بھی "سدھر" گئی لہذا مجھے امرتسر کے پاگل خانے میں داخل کر دیا گیا۔

اب میں دنیا کا سب سے بڑا بیوقوف بن چکا تھا!

خوش قسمتی سے مجھے پاگل خانے سے جلد ہی چھٹی مل گئی۔ میرا دماغ دوبارہ صحیح حالت میں آ چکا تھا اور اب مجھے پیٹ پالنے کے لئے کوئی کام کرنے کی فکر لاحق ہوئی۔ تمام پونجی تو معمہ سازوں کی نذر ہو چکی تھی۔ اس لئے کوئی باعزت

کام نہیں کر سکتا تھا۔ لہٰذا اُسی سے پانچ روپے اُدھار لے کر گول گپّوں کا خوانچہ لگانا شروع کر دیا۔ جب مجھے میرے یار دوستوں نے خوانچہ لگاتے ہوئے دیکھا تو انہیں میری حالتِ زار پر بے اختیار ترس آگیا۔ اور انہوں نے آپس میں چندہ اکٹھا کر کے مجھے تیل نکالنے کے وہ کولہو لگوا دیئے گذارہ اچھا ہونے لگا۔ اور میں عمر سازوں کی جان کو دعائیں دیتا ہوا نہایت بے عزتی سے تیل بیچنے لگا۔ چونکہ میں نے فارسی بھی پڑھی ہوئی تھی۔ اس لئے ایک دن تیل بیچتے بیچتے اُس محاورے کی یہ کہاوت بے اختیار میرے منہ سے نکل گئی۔ "پڑھے فارسی بیچے تیل۔ یہ دیکھو لوگ قسمت کے کھیل"

خیر جب مجھے تیل بیچتے ہوئے وہ تین مہینے گذر گئے تو ایک دن ایک پرانے دوست سے ملاقات ہو گئی جو کافی عرصہ کینیڈا میں رہ کر اچھی خاصی رقم جمع کر کے لایا تھا۔ عمر سازوں کے ہاتھوں جو میری گت بنی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ دانتوں تلے انگلیاں دبا کر رہ گیا۔ رو پڑے ہوئے گلے ملے میں نے اُسے اپنی عبرت آموز داستانِ غم سنانے کے بعد کہا "مجھے جو ہونا تھا سو ہو چکا۔ مگر لوگوں کو میری تباہی سے سبق سیکھنا چاہیئے۔ میں تو مرتے وقت اپنے بچوں کو نصیحت ہی نہیں۔ بلکہ وصیت کر جاؤں گا کہ بیٹا۔ چاہے تم کشمیر کی غار کے اندر گھس کر اس سے کبڈی کھیل لینا۔ چاہے ماؤنٹ ایورسٹ پر چڑھ کر قلا بازی لگا لینا۔ لیکن معمے کبھی نہ حل کرنا۔ خاص کر ہندوستانی اخباروں اور رسالوں کے"

یہ سُن کر میرا دوست کچھ سوچنے لگ گیا۔ میں سمجھا کہ وہ دل ہی دل میں

میری بیوقوفی کا ماتم کر رہا ہے۔ مگر وہ تھوڑی دیر کے بعد بولا "فکر نہ کرو۔ تمہارے روپے واپس مل سکتے ہیں۔ اور وہ بھی سود کے ساتھ"

"وہ کیسے؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"معموں کے ذریعہ ہی" وہ بڑے اطمینان سے بولا

"کیا مطلب ہے تمہارا۔ کیا تم چاہتے ہو کہ میں پھر معمے بازی شروع کر کے اپنے بچے کھچے کوڑیوں کو بھینٹ کر ڈالوں اور دوبارہ امرتسر کے پاگل خانے میں ٹہلتا ہوا نظر آؤں؟" میں نے قدرے رنجش سے پوچھا۔

"نہیں اس دفعہ تم معمے باز نہیں بلکہ معمے ساز بنو گے"

"یعنی"؟

"یعنی یہ کہ اب میں اور تم مل کر ایک رسالہ جاری کر کے معمہ سازی کا کام شروع کر دیں گے۔ بعد ہمارے پہلے ہی معمے کا پہلا انعام پچاس ہزار روپے کا ہوگا"

"مگر اتنی رقم کا انتظام کہاں سے ہوگا۔ میرے پاس تو اس وقت پچاس ہزار روپے تو کجا پچاس ہزار اٹھنیاں بھی نہیں ہیں۔"

"روپوں کا فکر تم مت کرو ------ میں سب انتظام کر لوں گا۔"

قصہ مختصر ہم نے چند روز بعد خدا کا نام لے کر ایک رسالہ جاری کر دیا اور اپنے معموں کا نام رکھا "لکشمی معمے"۔ اپنے رسالے کے علاوہ دوسرے رسالوں اور اخباروں میں بھی اس کی خوب پبلسٹی کروائی۔ ہمارے "معمے" کا پہلا انعام تھا۔ پچاس ہزار روپے اور فیس داخلہ ایک روپیہ۔

خوش قسمتی سے ہمیں پہلے ہی مہینے کے داخلوں کی فیس کوئی ایک لاکھ اسی ہزار روپوں کے قریب وصول ہوئی۔ بس پھر کیا تھا۔ مارے خوشی کے ہماری باچھیں کھلی جا رہی تھیں اتنی آمدنی دیکھ کر مجھے پختہ یقین ہو گیا کہ ابھی تک ہندوستان میں بے وقوفوں کی کمی نہیں ہے۔ میں نے تو اپنے آپ کو ہی سب سے زیادہ بیوقوف سمجھتا تھا۔ مگر مجھے یہ پتہ نہیں تھا کہ ان گنت لوگ مجھ سے بھی زیادہ "پہنچے ہوئے" ہیں۔

جب انعام جیتنے والوں کی فہرست تیار ہونے لگی تو میں نے اپنے دوست سے کہا۔

"پچاس ہزار تو ہو گئے پہلے انعام کے اور بیس ہزار چار غلطیوں تک کے انعام والوں کے۔ یہ تو ہو گئے ستر (٧٠) ہزار۔ اور ان میں دس ہزار ڈال دو پبلسٹی اور دیگر اخراجات کے۔ کل ملا کر ہو گئے اسی (٨٠) ہزار۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں تیس ہزار کا خالص منافع ہوا۔ اور وہ بھی پہلی مرتبہ میں ہی"۔

"تم بھی بہت بھولے ہو" میرا دوست طنزیہ لہجے میں بولا۔

"کیوں۔ کیا حساب میں کوئی غلطی ہو گئی ہے؟" میں نے گھبراتے ہوئے پوچھا

"نہیں۔ اس میں حساب کی کوئی غلطی نہیں" میرا دوست مسکراتا ہوا بولا۔ "اگر تم ایسے ہی ایمانداری سے لوگوں کو انعام دینے لگ گئے تو پھر کر چکے معمہ سازی معمے اور ایمانداری دو متضاد چیزیں ہیں۔ اور یہ دونوں ایک جگہ ہرگز ہرگز اکٹھی نہیں رہ سکتیں۔ ہم ساری رقم میں سے دس ہزار روپیہ ہی تقسیم کریں گے۔

صرف دس ہزار۔ یہ کہہ کر حیرانگی کے عالم میں میرا منہ کھلے کا کھلا ہی رہ گیا۔

جی ہاں۔ دس ہزار صرف۔ یہ بھی پہلا موقع ہونے کی وجہ سے دے رہا

تھی۔ ورنہ ہم ہزار پانچسو میں ہی معاملہ نپٹا لیتا۔" میرا دوست فخریہ انداز میں بولا۔

"مگر یہ سب ہو گا کیسے! کیا دوبارہ معمہ نکالنے کا ارادہ نہیں ہے؟" میں نے احتجاج کرتے ہوئے پوچھا۔

"تم بھی نرے کاٹھ کے الو ہو۔ تم کیا جانو معمے سازی کے راز۔ بس چپ چاپ تیل ہی بیچتے رہو۔ دیکھو میں سب کچھ کیسے نپٹاتا ہوں۔"

چند روز بعد۔ جب انعامات کی مکمل فہرست شائع ہوئی۔ تو پہلا انعام میرے دوست کے بھانجے کے نام نکلا اور چھوٹے انعامات کی فہرست میں آدھے نام جعلی تھے!

میری حیرانی کی کوئی حد نہ رہی۔ جب کہ دوسرے معمے میں ہمیں دو لاکھ روپے کے قریب فیس داخلہ وصول ہوئی۔ حالانکہ میرا خیال یہ تھا کہ اس دفعہ ہمیں ڈیڑھ ہزار روپے کا بھی دیدار نصیب نہ ہوگا۔ مگر داد دینی چاہیئے ہندوستانیوں کی سادہ لوحی کی ان کے ساتھ جتنا بھی زیادہ دھوکا ہوتا ہے یہ اتنی ہی گرمجوشی سے مزید دھوکا کھانے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ جوں جوں ہمارے معمے نکلتے گئے توں توں ہمارا بینک بیلنس بڑھتا گیا۔ چھ ماہ کے آخر میں ہمارے پاس اٹھارہ لاکھ روپے سے بھی زیادہ روپے جمع ہو گئے۔ "لکشمی معمے" واقعی ہمارے گھر میں لکشمی لانے کا موجب بن گئے۔ اب میرے پاس جدید امریکن طرز کی کوٹھی ہے۔ ایک چھوڑ دو ہو گئیں ہیں۔ اور سوئٹزرلینڈ کو کیا سارے یورپ کی سیر کر چکا ہوں۔ مختصر یہ کہ ہر قسم کا سامان آرائش

آرام اور آسائش سے ہوں اور جب کھوائے عیش کے مزے لوٹتا ہوں۔ سماج میں بھی درجہ اونچا ہو گیا ہے ہمارے معمے کا پہلا انعام عام طور پر ایک پبلک تقریب میں کسی وزیر کے دست مبارک سے ہی دلوایا جاتا ہے یوں تو ہمیں ہر قسم کی فارغ البالی حاصل ہے۔ مگر کچھ مہینوں سے ایک کانٹا سا دل میں کھٹک رہا ہے۔ بات یہ ہوئی کہ چند حاسدوں نے یہ آواز اٹھانی شروع کر دی ہے کہ معمہ پر گورنمنٹ کو کنٹرول کرنا چاہیے۔ اگر ہو سکے تو ان کو سرے سے ہی بند کر دینا چاہیے۔ نہیں تو ان کے حساب کتاب پر کڑی نظر رکھ کر باقاعدہ پڑتال کرنی چاہیے سنیے کوئی حکم نہیں یہ گورنمنٹ کے کام ہیں۔ ایسے قانون بنتے بنتے بھی بنیں گے۔ جب تک ان کی سوجھ اس وقت تک ہم اتنا روپیہ اکٹھا کر چکے ہوں گے کہ پھر تو کیا ہماری سات پشتیں بھی اسے ختم نہ کر سکیں گی سچ تو یہ ہے سٹے بازی سے بڑھ کر روپیہ کمانے کا اور کوئی آسان طریقہ نہیں۔ اسی وجہ سے ہم آج دنیا کے سب سے زیادہ عقل مند آدمیوں میں سے ایک ہیں۔

معمے زندہ باد! اکھ سبھا پائندہ باد! قومی حکومت مردہ باد!!

میں نے اخبار پڑھنا کیوں چھوڑا

جس دن سے میں نے اخبار بینی ترک کی ہے اسی دن سے بعض میرے
دوست و احباب طرح طرح کی قیاس آرائیاں کر رہے ہیں۔ ایک دوست کا
خیال ہے کہ شاید میری نظر خوفناک حد تک کمزور ہو گئی ہے اسی وجہ
آنکھوں کے کسی ماہر ڈاکٹر نے مجھے ہر قسم کے مطالعہ سے منع کر دیا ہو۔ جب
ان حضرت کے اس سنسنی خیز انکشاف پر حاشیہ آرائی کرتے ہوئے ایک دوسرے
صاحب فرماتے ہیں :

”ضرور یہی بات ہو گی ورنہ ایک ایسا شخص جسے روزانہ کم از کم تین اخبار پڑھے
بغیر کھانا ہضم نہ ہوتا ہو وہ عام حالات میں یک لخت اخبار بینی نہیں چھوڑ
سکتا۔ میں تو پہلے ہی اسے کہا کرتا تھا کہ وہ اخباروں۔ ناولوں اور رسالوں
وغیرہ کا زیادہ مطالعہ نہ کیا کرے۔ مضمون کم لکھا کرے۔ نظر تو اس کی
پہلے ہی کمزور تھی اب اور زیادہ ہو گئی ہو گی۔ وہ بھلا کب کسی کی سنتا ہے
اب بچو جی کو جب آنکھوں کا اپریشن کروانا پڑے گا تب یاد آئے گی میری
نصیحت۔ ایک اور صاحب کا خیال ہے کہ میں آہستہ آہستہ تارک الدنیا ہوتا
جا رہا ہوں کیونکہ سگریٹ پینے تو میں نے پہلے ہی چھوڑ دیئے ہیں۔ اب
اخبار بینی سے بھی کنارہ کشی اختیار کر لی ہے۔ تھوڑے عرصہ کے بعد ریڈیو
سننے کو چھوڑنے کی بھی صلاح کر رہا ہوں۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ میری جان پہچان والوں کے یہ سارے اندازے
غلط ہیں۔ نہ تو مجھے آنکھوں کے کسی سپیشلسٹ نے ایسی خطرے کی لال بتی
دکھائی ہے اور نہ ہی میری ذہنی حالت کسی گڑبڑ کا شکار ہے۔ نہ تو میں دنیا

سے تنگ آ کر گوشۂ عافیت اختیار کر رہا ہوں اور نہ ہی مجھے فالتو وقت کی قلت کی شکایت پیدا ہوتی ہے۔ اب آپ قدرتی طور پر پوچھیں گے کہ پہلے والی اگر یہ بات نہیں ہے تو پھر تمہیں ترکِ اخبار بینی کی حاجت کیوں پیش آئی۔ کیا تمہیں خواب میں کسی بزرگ نے آ کر کہا ہے کہ تم اخبار پڑھنا بند کر دو۔ نہیں حضرت نہیں یہ بات نہیں ہے۔ میری اخبار بینی کے تجربے نے مجھ پر چند ایک ایسی مکروہ حقیقتوں کو آشکارا کیا ہے کہ اگر وہ حقیقتیں آپ پر بھی منکشف ہو جائیں تو شاید ...... شاید کیا یقیناً آپ بھی آج ہی اخبار پڑھنا چھوڑ دیں۔ تو لیجئے سنئے کہ میں نے اخبار پڑھنا کیوں چھوڑا۔

بے لاگ تبصرے، صحتمند تنقید، تعصب سے بالاتر آرٹیکل اور شگفتہ ادب تو ہمارے اخبارات کا ایڈیٹر سے لینے پر بھی کہیں دکھائی نہیں دیتے۔ اختلافات ہمارے اخبار نویس اصولوں کی بلند چوٹی سے لڑھک کر ذاتیات کی گہری کھائی میں گر پڑتے ہیں اور ایک دوسرے پر اس طرح کیچڑ اچھالتے ہیں کہ بیچارے قارئین بھی اس کیچڑ کے چھینٹوں سے محفوظ نہیں رہتے۔ اسی طرح ایک دفعہ دو اخباروں کے ایڈیٹروں کے درمیان بحث چھڑ گئی۔ پہلے چند روز تو وہ دلائل سے ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش کرتے رہے۔ جب اس میدان میں انہیں ناکامی ہوئی تو وہ ذاتیات پر اتر آئے۔ ایک ایڈیٹر نے لکھا۔

" ... صاحب، آپ تو کچھ عرصہ پہلے ... [illegible]

لگا رہے ہیں کہ فلاں فلاں "مستعفی ہو" گئے دنوں تک آپ نے کون سا عذر
ادا کیا تھا۔ عوام کو تو دھکا دے کر جیل میں پہنچا دیا اور خود اپنے بیٹے
کو ان دنوں ولایت بھجوا دیا۔ بہانہ یہ بنایا کہ برخوردار اونچی تعلیم حاصل
کرنے کے واسطے گئے ہیں اور آپ بذات خود خرابی صحت کی بنا پر اپنے دفتر
میں چوڑیاں پہن کر بیٹھے رہے۔"

اس کے جواب میں دوسرے ایڈیٹر نے لکھا "آپ کو اب سفید جھوٹ
بولتے ہوئے شرم سے چلو بھر پانی میں ڈوب مرنا چاہیے۔ عوام آپ کی اصلیت
سے اچھی طرح واقف ہیں۔ میں تو ان دنوں واقعی سخت بیمار تھا۔ ڈاکٹروں نے
چلنا پھرنا بالکل منع کیا ہوا تھا۔ صرف اخبارات کے لئے ایک دو آرٹیکل
لکھنے کی اجازت دی ہوئی تھی۔ اسی سے میں جنتا جناردھن کی سیوا کرتا
رہا۔ میں ہی جانتا ہوں کہ میرا دل ان دنوں جیل میں جانے کے لئے کتنا بیقرار
تھا۔ لیکن آپ شاید بھول گئے کہ کیسی مجبوری کی حالت میں آپ کو مستعفی ہو
کرنا پڑا تھا آپ تو مستعفی ہرگز نہ ہوتے اگر مستعفی ہو کر یہ ڈپٹی کمشنر اور چیف
سیکرٹری بار بار سرخ جھنڈی آپ پر زور نہ ڈالتے اور آپ کو یہ دھمکی نہ دیتے کہ
آپ کے مستعفی ہو جانے کی ضرورت ہے۔ مشتعل لوگ آپ کے دفتر پر دھاوا
بول دیں گے۔ آپ کے فرنیچر اور کاغذات وغیرہ کو نذر آتش کرنے کے بعد
آپ کی جان کے لاگو ہو جائیں گے۔ یہ تو تھا آپ کے مستعفی ہونے ......
کے ذاتی طور پر شامل ہونے کا پس منظر۔ ویسے آپ کی دلیری [illegible]
عوام سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔ جب ذلیل اور شرمناک طریقے سے آپ نے

مشہور تاجر سیٹھ لدھارام کو بلیک میل کرنے کی کوشش کی تھی وہ بھی کیا بے بنیاد
نہیں ہے اور تو اور ابھی تک آپ کو کسی سے بات کرنے کا سلیقہ تک نہیں آیا۔ پچھلے
دنوں تعلیم منسٹری کی پریس کانفرنس میں ان سے باتیں کرتے ہوئے جب آپ
کو چھینک آئی تو مجھے کہ آپ کو اکثر آتی ہی رہتی ہے تو آپ سے یہ بھی نہ ہو سکا
کہ آپ اپنے منہ پر ہاتھ ہی رکھ لیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ چھینک سے چھینٹے اور
دوسرا مواد تعلیم منسٹری صاحب کی داڑھی اور دیگر معززین کے کپڑوں پر جا پڑا۔ آپ سے
یہ بھی نہ ہو سکا کہ اپنی اس مضحکہ خیز حرکت کے لئے دوسروں سے معافی مانگ لیتے یا
صرف ایک لفظ "سوری" ہی کہہ دیتے۔ آپ نے سیٹھ جی کے دل میں میرے
عزیز کے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے ولایت جانے پر تو اعتراض کیا ہے
لیکن اپنے برخوردار کا قصہ بھول گئے کہ گورنمنٹ کالج کے پرنسپل نے اسے
ایک لڑکی سے فحش مذاق کرنے پر کالج سے باہر نکال دیا تھا۔

دیکھا آپ نے ہمارے اخبار نویسوں کا معیار۔ کیا یہی
لوگ ہمارے تعلیمی اور تمدنی معیار کو بلند کریں گے؟ کیا یہی لوگ ہمارے عوام
کو سنواریں گے؟ یہ اشخاص اپنے اخباروں میں دوسرے لوگوں کے کارٹون
چھاپ کر ان کا مذاق تو اڑاتے ہیں لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ ایسی مضحکہ خیز
اور پست اخلاق تحریروں سے وہ عوام کی نظروں میں خود کارٹون بن جاتے ہیں۔

ہاں صاحب۔ یہ تو تھی میری ترک اخبار بینی کی سب سے بڑی وجہ۔ اب آگے
بالاختصار کچھ حالی دوسری وجوہات کا بھی سن لیجئے۔ ہمارے اخبارات میں ایک
دو کالم کی خبروں کے علاوہ باقی سب خبریں فضول اور گمراہ کن ہوتی ہیں مثلاً

ایک تماش بین کے نیچے آکر ہلاک ہوتے ہوتے بچا دھکا دے گیا ۔ تھوڑی ہی دور آگے

چل کر وہی بس ایک حادثہ کا شکار ہو گئی ۔ تین آدمی مارے گئے اور چار افراد

شدید زخمی ہوئے جن میں ایک حاملہ عورت بھی شامل ہے ۔

ڈبی بازار میں دو سانڈوں کی لڑائی ۔ تماشہ دیکھنے کے لئے

سینکڑوں لوگ جمع ہو گئے ۔ ایک گھنٹے کے لئے ٹریفک معطل ہو گیا ۔

موضع بھوڑا میں جاٹوں کی دو مخالف پارٹیوں میں زبردست

تصادم ۔ لاٹھیوں کلہاڑیوں اور گنڈاسوں کا آزادانہ استعمال ۔ چھ اشخاص مارے

گئے ۔ اگر پولیس بروقت مداخلت نہ کرتی تو شاید ساڑھے نو قتل اور ہو جاتے

جو ہاں طرفین میں ایک لڑکا بھی شامل تھا ۔

قصبہ کلاں میں ناجائز شراب کی بھٹی ۔ ہوئی بھی پکڑی گئی ۔ مالک بھی بدنصیب تھی

بیچارہ ۔ اگر لڑکی ہوتی تو شاید بچ جاتی ۔ (!)

جالندھر ۔ محلہ کرم پورہ کی ایک گائے نے عجیب و غریب بچھڑا جنا ہے

بچھڑے کے دو سر اور چھ ٹانگیں ہیں ۔ دم سر سے ہی غائب ہے ۔ لوگ دور دور

سے اس عجوبہ قدرت کو دیکھنے کیلئے ہزاروں کی تعداد میں آ رہے ہیں ۔

یہ تو رہیں خبریں ۔ اب آئیے ان تصویروں کی طرف جو کہ تازہ تازہ

شادی شدہ جوڑوں کی اکثر چھپتی رہتی ہیں ۔ کسی کی شادی ہو یا نہ ہو اس سے الگ

دوسروں کو کیا واسطہ خیر چھوڑیئے اگر کسی نہ کسی طرح حسب ارمان شادی ہو بھی گئی تو

آپ لوگوں کو رنج ۔ بیویوں کی نمائش سے کیا فائدہ ۔ اب ذرا کوئی ان اخبار

والوں سے پوچھے کیوں صاحب کیا آپ نمائش پر جرمانہ لاگو کرنے لگے ہیں

اپنے "جھاڑو" کے ذریعے شائع کر رہے ہیں؟"

اسی طرح کوئی اور فوٹو شائع ہوتے رہتے ہیں جن کے نیچے کچھ اس طرح لکھا ہوتا ہے۔ "یہ ہیں مسٹر ایس۔ آر۔ گجراج آف میسرز فری انڈیا ٹریڈرز جو کہ اپنے کاروبار کو فروغ دینے کے سلسلے میں پچھلے ہفتے یورپ کی جانب روانہ ہو گئے۔ امریکہ، کینیڈا، انگلینڈ اور جرمنی کے دورے پر روانہ ہو رہے ہیں۔" اب یہ کہاں کی عقل ہے؟ گجراج صاحب کاروباری مقصد سے غیر ممالک میں جانا چاہتے ہیں تو جائیں شوق سے، انہیں کون روکتا ہے۔ بیچارے قارئین کو کیوں خواہ مخواہ بور کر رہے ہیں مسٹر گجراج۔ اگر کاروبار کو فروغ دیں گے تو ہمیں اخبار بینوں کو اس سے کیا فائدہ۔ غیر ممالک سے واپسی پر مسٹر گجراج اخبار بینوں کے لئے سوغات تو نہیں لے آئیں گے!

رنگین تصویروں اور غیر ضروری تصاویر کو چھوڑ کر اب ذرا اشتہارات کی طرف آئیے۔ عموماً اخبارات کے کل صفحوں کی ایک تہائی جگہ یہ اشتہار گھیرتے ہیں بلکہ بعض اوقات تو اس سے بھی زیادہ جگہ پر چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان اشتہاروں میں جن چیزوں کی جتنی تعریف کی گئی ہو اگر انہیں خریدنے پر وہ تعریف کا دسواں حصہ بھی سچ ثابت ہوں تو خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرنا چاہیے۔ ایک دفعہ میں نے ایک سیکنڈ ہینڈ کار کا اشتہار پڑھا جس کا مضمون حسب ذیل تھا

برائے فروخت

ایک پرانی کار نہایت ہی اچھی حالت میں، دیکھنے میں دیدہ زیب

قیمت تقریباً پانچ ہزار روپے نمبر ۹۱۲۴۳

اس اشتہار کے سلسلے میں جب میں اخبار کے ایڈیٹر سے کار کے مالک کا پتہ لے کر ملا تو اپنی زبان سے بھی اس نے کار کی بہت تعریف کی لیکن اس نے کار دکھلائی تو میں دیکھتا ہی رہ گیا۔ اشتہار کے مطابق کار دیدہ زیب تھی لیکن حقیقت میں دیدہ فریب نکلی۔ جگہ جگہ سے روغن اکھڑا ہوا تھا جب میں نے ٹرائی کے لئے سٹیرنگ STEERING سنبھالا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں کار نہیں بلکہ ٹریکٹر دھکیل رہا ہوں۔ انجن کی اتنی آواز آرہی تھی کہ سڑک پر راہگیروں کو خبردار کرنے کے لئے مجھے ہارن بجانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ کار کے اندر بیٹھی ہوئی سواریاں کار کا انجن بہت ڈھیلا ہونے کی وجہ سے اس طرح ہانپ رہی تھیں جیسے ملیریا بخار چڑھنے پر سردی محسوس ہونے کی وجہ سے کوئی مریض کانپ رہا ہو۔ دو تین میل کی ٹرائی لینے کے بعد میں یکدم کار سے نیچے اتر پڑا۔ جب اس کے مالک نے میری رائے دریافت کی تو میں نے جواب دیا۔ بہتر ہوگا کہ آپ اپنی کار کو محکمہ آثار قدیمہ کے سپرد کر دیں۔ یہ کہہ کر میں اُن کے چہرے کو دیکھے بغیر ہی چلا آیا۔

اسی طرح ایک دفعہ میرے ایک سیدھے سادے دوست نے ایک اخبار میں کسی رنگ گورا کرنے والی دوائی کی بہت تعریف پڑھی۔ اشتہار پڑھ کر تو انہیں محسوس ہوتا تھا کہ اگر کوئی حبشی بھی اسے استعمال کرنا شروع کر دے۔ تو چند دنوں میں ہی اس کی جلد اتنی گوری اور خوبصورت ہو جائے گی کہ اگر پرستان کی حوریں بھی اسے

دیکھیں تو فوراً بیزار جان سے اس پہ عاشق ہو جائیں ۔ لیکن اس دوائی کے استعمال کے بعد میرے دوست کا رنگ تو نیا گورا ہو گیا تھا اُسکے اس کے منہ پر چھالے پڑ گئے اور وہ بیچارہ کئی دنوں تک مرہم پٹی کرتا رہا ۔ میرے خیال میں تو اس دوائی کا مشتہر کوئی دھوبی تھا ۔ اس نے دیکھا ہوگا کہ جب پانی میں تحلیل شدہ تیزاب سے کپڑوں کی میل اور کالاپن دور ہو جاتا ہے تو کیوں نہ اس تکنیک کو دوائی بنا کر کالے رنگ والوں کو گورا کرنے کا ٹھیکہ لے لیا جائے ۔

میرے اخبار بینی کو ترک کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مندرجہ بالا خرافات کے علاوہ اخبار میں جو جگہ بچتی ہے اس کا ایک معقول حصہ منڈیوں کے بھاؤ کمپنیوں کی خبروں ، عدالتوں کے سمن ، ٹینڈر نوٹس کے اشتہاروں وغیرہ میں ضائع ہو جاتا ہے ۔ کیا بیوپاری اور کھلاڑی لوگ "مددگار بیوپاریاں یا "سپورٹس مین" جیسے اخبار اور رسالوں کو خرید کر اپنا شوق نہیں پورا کر سکتے جو روزانہ ان کے لئے ایک صفحہ اخبار میں مخصوص کیا جاتا ہے ۔

ان سب چیزوں کے علاوہ "موسم کا حال" اسی نام سے ایک کالم اور چھپا ہوتا ہے ۔ موسم کے بارے میں جتنی پیشگوئیاں ان کالموں کی غلط ہوتی ہیں اتنی تو شاید ہمارے وقت کے نام نہاد نجومیوں کی بھی غلط نہ ہوتی ہوں گی ۔ اگر اس کالم میں یہ پیشگوئی ہو کہ آج فلاں جگہ موسم ابر آلود رہے گا تو اکثر اوقات یہ دیکھا جاتا ہے کہ وہاں سورج اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا ہوتا ہے ۔ اور اگر یہ لکھا ہوا ہو کہ آج فلاں علاقوں میں آندھی آئے گی تو وہاں دیکھنے میں آتا ہے کہ آندھی تو

درکنار ہوا سنید ہو جانے کی وجہ سے ایک پتہ تک نہیں پڑتا۔

صاحبان یہی تھیں وہ وجوہات جو میری ترکِ اخبار بینی کا باعث بنیں۔ اس لیے اب اخبار پڑھنا تو درکنار اُسے دیکھنے تک کو میرا دل نہیں کرتا ان تمام باتوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے اگر آپ اب بھی اخبار پڑھنے پر مصر ہیں تو پھر میں آپ کے حق میں دعائے خیر کے سوا اور کر ہی کیا سکتا ہوں!

ایک ادیب کی فریاد

کل شام جب میں دفتر سے گھر واپس آ رہا تھا تو شہر کے سب
سے بارونق چوک میں ایک نہایت ہی دلچسپ منظر دیکھنے میں آیا۔ بیشمار
لوگوں کے درمیان کھڑا ہوا ایک نورانی ادھیڑ عمر کا شخص اپنے سر پر زور
زور سے جوتے مار مار کر کہہ رہا تھا "تف ہو تجھ پہ ۔ میری بدقسمتی کی کون سی منحوس
گھڑی میں مجھ سے ادیب بننے کی لاتعقل حرکت سرزد ہو گئی۔ جس دن
سے میں نے یہ ذلیل پیشہ اختیار کیا ہے اسی دن سے مجھے کبھی دو وقت
پیٹ بھر کر کھانا نصیب نہ ہوا۔ حالانکہ میں نے ادیب بننے کو ترجیح صرف
اس لئے دی تھی اور دولت و شہرت حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ سمجھا

تھا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ یوروپ، امریکہ اور دیگر ممالک کے مقابلہ میں
ہمارے ملک کے ادیبوں کی حالت نہایت ہی کمر توڑ اور خستہ ہے۔
مسلسل فاقوں کے باعث میرا پیٹ پیٹھ سے جا لگا ہے۔ ان دنوں
میں بے شمار ہڈیاں ابھرنے کے باعث ایک ایسی دلفریب کیفیت پیدا ہو گئی
ہے کہ ایک دفعہ ڈاکٹر صاحب کو سٹیتھوسکوپ لگاتے وقت یہ معلوم
کرنا دشوار ہو گیا کہ "میرے پیٹ کو ٹسیٹ کر رہے ہیں یا پیٹھ کو"۔ جب
سے میں نے لکھنا شروع کیا ہے، تب سے لگاتار میرے سر کے بال
گھٹتے جا رہے ہیں۔ اور عینک کے شیشوں کے نمبر بڑھتے جا رہے
ہیں۔ میری صحت اور شکل و صورت اس قدر بگڑ چکی ہے کہ اب مجھ
میں آئینہ دیکھنے کی جرأت بھی باقی نہیں رہی ہے۔ جب کبھی بھولے بھٹکے
پنواڑی کی دوکان پر یا کسی اور جگہ آویزاں آئینے میں مجھے اپنی شکل نظر
آ جاتی ہے تو میں شرم کے مارے گردن جھکا لیتا ہوں۔ کیونکہ مجموعی طور
پر میری اور اخبارات میں چھپنے والے "زخموں" کی شکلوں میں کوئی نمایاں
فرق نہیں ہے۔ مارے کمزوری کے میرا وزن اس قدر کم ہو گیا ہے
کہ اب میں منوں کی بجائے سیروں اور چھٹانکوں میں تولا جا سکتا ہوں
اس لئے جب کبھی آندھی آتی ہے اور میں گھر پر نہیں ہوتا ہوں تو میری بیوی
اور بچے اس وقت تک اطمینان کا سانس نہیں لیتے۔ جب تک کہ میں
واپس گھر صحیح سلامت نہیں پہنچ جاتا۔ تیز ہوا کا ایک جھونکا مجھے کسی [illegible] کے ہتھے [illegible]

کی طرح کہیں سے کہیں پہنچا سکتا ہے۔

کہتے کہ تو میں نے تقریباً دو درجن ناول بے شمار نظمیں اور سینکڑوں افسانے لکھے ہیں۔ مگر افسوس جیب بھرنا تو درکنار میں وہ وقت اپنا اور بال بچوں کا پیٹ تک نہ بھر سکا۔ تھوڑی بہت شہرت تو مجھے ضرور مل گئی ہے۔ مگر دولت دوربین لگا کر دیکھنے سے بھی دور دور تک کہیں نظر نہیں آتی۔ آج تک جتنے کاغذ میں نے لکھ لکھ کر سیاہ کئے ہیں اگر انہیں ناشروں اور اخباروں و رسالوں کے مالکوں کی بجائے کسی کباڑیئے کو ردی کے بھاؤ ہی دے دیتا تو شاید ان لوگوں سے معاوضے کی نسبت کہیں زیادہ رقم وصول کر لیتا۔ ہمارے ملک میں ادیبوں کی تن اور من سے تو کبھی کبھی ضرور خدمت کی جاتی ہے۔ لیکن دھن کو ان کے قریب تک نہیں پھٹکنے دیا جاتا۔ انہیں دولت دیکھنے کو تو کیا سونگھنے تک کو نہیں ملتی شاید ناشر طبقہ انہیں فارغ البالی اس لئے میسر نہیں ہونے دیتا کہ مبادا وہ عیش پرستی میں پڑ کر کہیں لکھنا ہی نہ چھوڑ دیں۔ اس وقت میرے ذہن میں اپنے ملک کے ایماندار ناشروں کی کئی ناقابل فراموش یادیں گشت لگا رہی ہیں۔ پہلے ان کی ادب نوازی کی ایک مثال سنیئے اور بیٹھے بیٹھے اپنا سر دھنتے رہیئے۔ ایک دفعہ ایک مشہور ناشر کے بار بار فرمائش کرنے پر میں ایک ناول لکھ کر ان کے پاس لے گیا۔ یہ ناول انہیں بہت ہی پسند آیا۔ اور

بعد شائع ہونے کے سبب قارئین سے بھی کافی سراہا۔ ناشر صاحب کئی مہینے
تک اسکے معاوضے کی ادائیگی کے بارے میں لیت و لعل سے کام لیتے رہے
جب ان کے دفتر کے [illegible] کے کئی چکر لگ گئے یا میں چکر کاٹ چکا تو ایک
دن میرے صبر کا پیمانہ چھلک گیا اور میں نے جھلا کر پوچھا "آپ کا ارادہ
کیا ہے؟ آپ معاوضے کی ادائیگی کیوں نہیں کرتے؟"

"کیسا معاوضہ؟ کون سی ادائیگی؟" ناشر صاحب بے رخی کے انداز میں پوچھنے
لگے۔

"کیسی ادائیگی! ناول لکھنے کی .... اور کیسی!"

"اجی صاحب" ناشر صاحب قہقہہ لگاتے ہوئے بولے۔ "معاوضہ تو ہمیں
ملنا چاہیئے جو آپ کی ہزاروں روپیہ کی پبلسٹی ([illegible]) مفت میں
کر رہے ہیں۔ ہم نے آپ کو گوشۂ گمنامی سے باہر نکال کر آسمانِ ادب کا ایک
درخشندہ ستارہ بنا دیا ہے۔ ملک کے کونے کونے میں آپ کے نام کا ڈنکا
بجوا دیا ہے۔ مگر آپ ہیں کہ ابھی تک معاوضے کی رٹ لگائے جا رہے ہیں۔
..... خیر آئندہ جب کبھی آپ کوئی سیاسی [illegible] لکھ کر لائیں گے تو
آپ کو ضرور کچھ نہ کچھ معاوضہ دیا جائے گا۔ خاطر جمع رکھیں۔"

صاحبو! ادیبوں کی اس ناگفتہ بہ حالت کو دیکھ کر تب آج
بر سرِ عام کھڑا ہو کر [illegible] سر پر جوتے لگا رہا ہوں تاکہ دیکھنے والوں
کو عبرت حاصل ہو اور وہ کبھی بھولے سے بھی ادیب بننے کی حماقت
نہ کریں۔ [illegible] سرمایۂ ادب میں [illegible] رکھا [illegible] وقت [illegible]

ذہن میں اپنے درخشاں مستقبل کے متعلق ایک نہایت خوش رنگ اور
پرکشش محل کے نازک نقوش ابھرنے لگتے۔ میں سوچتا کہ جلد ہی میرا شمار
ملک کے چوٹی کے ادیبوں میں ہونے لگے گا۔ پڑھے لکھے طبقے میں میرا نام
نہایت ہی احترام سے لیا جائے گا۔ دولت اور شہرت کی دیویاں میرے
گھر کے باہر چپراسیوں کی طرح کھڑی ہو کر میرے احکام کا انتظار کیا کریں گی
مجھے راستہ میں چلتے پھرتے دیکھ کر لوگ اپنے ساتھیوں سے سرگوشیوں
میں کہا کریں گے "ارے پہچانا نہیں آپ نے۔ یہی تو ہیں ہمارے
سب سے بڑے ادیب جن کی تحریروں نے سارے ملک کو اپنا دیوانہ بنا رکھا
ہے۔ ہمارے اس وسیع ملک میں پھیلی ہوئی بے شمار ادبی انجمنیں مجھے اپنا سرپرست
کہلوانے پر فخر محسوس کیا کریں گی۔ بڑے بڑے نقاد میری بلند پایہ تحریروں
سے مرعوب ہو کر میرے سامنے سجدہ کیا کریں گے۔ میرے ہم وطن میری
تصنیفات کو اپنے ہاتھوں میں لے کر بڑے فخر سے غیر ممالک کے لوگوں کو
ایک کھلا چیلنج دے کر کہہ سکیں گے "دیکھو ہمارے ملک کے ایک
مصنف نے ادبی شہ پاروں کے کیسے کیسے اچھوتے معیار قائم کیے ہیں۔ کیا
آپ کے کسی موجودہ یا سابقہ ادیب کی تحریریں ہمارے ملک کے اس مایۂ ناز
سپوت کی تحریروں سے ٹکر لے سکتی ہیں؟"
مگر افسوس تھوڑے ہی عرصہ کے لیے مجھے آٹے دال کا بھاؤ معلوم
ہو گیا۔ آٹے دال کا بھاؤ تو میں نے یونہی کہہ دیا ہے ورنہ حقیقت یہ ہے
کہ دیگر ضروری اجناس مثلاً چاول، چینی، گھی اور دوسری چیزوں کے نرخ بھی کچھ

زبانی یاد ہو گئے - میرے استقبال کے تبدیلی ہوئی - خیالی محل کے ستون جیسے لمحہ
میں گرے گئے جو حقیقت چھپو - ہو گئے معرفت سے اسے یقین لوگوں - کے علاوہ معبود
کتابیوں میں میرا شمار ہونے لگا ہے - ہر شخص کے بھونے لگ ہیں نے خود اپنے
کانوں سے لوگوں کو اپنے متعلق سرگوشیاں کرتے ہوئے سنا تھا۔ اس عقل کے دشمن نے
اپنی زندگی تو دوش پیانگ قیمتی کیا تباہ ہیں لکھ لکھ کر برباد کرنی ہی تھی - مگر اس قدر
ذہن نے اپنے بچوں کے مستقبل کا بھی ستیاناس کر دیا ہے - اگر اس کے دماغ میں
عقل کا کچھ سہارا مادہ بھی باقی ہوتا تو وہ اب جو کوئی چھوٹی سی دوکان کھول
لیتا اچھا ہے - چاہے وہ تمباکو یا پکوڑوں کی ہی کیوں نہ ہو - ایسا کرنے سے بے کار
کم از کم اپنا اور بیوی بچوں کا پیٹ تو بھر سکے گا" اگر میں اس وقت ان سمجھدار
لوگوں کی قیمتی نصیحت پر عمل کرتا - تو شاید آج میرا اتنا مذاق نہ ہوتا کاش
میرے دماغ سے ادب دوستی کا جنون نکل گیا ہوتا - مگر اس وقت میری حالت
سانپ کے منہ میں چھچھوندر جیسی تھی - میں اپنی طبیعت کے تقاضوں سے مجبور ہو کر
ادب ہی کے بھیانک جنگل سے باہر نہ نکل سکا - نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ میں خوشحالی
کے پرسکون جزیرے پر لینے کی بجائے قرضے کی خوفناک اور گہری دلدل میں دھنس
گیا - اب میرے ہمسر لوگوں کا تمسخر بڑھتا چڑھتا ہوا ہے کہ یہ تو
کیا میرے پہلے پچھلے بھی گئے نہیں اتار سکے - وہ اشاعت کے سب
سے بڑے مسخرے یعنی خدا کے سیدھے طریقے تو ملاحظہ ہو شروع وہ لوگ
جو اپنی شعلہ بار تحریروں سے قوم اور ملکوں کی تقدیریں بدل سکتے تھے
خود اپنی بدقسمتی کی سیاہ لکیروں کو بھی نہ مٹا سکے - وہ اپنے روشن خیالات

سے دنیا کو تو منور کر سکتے ہیں۔ لیکن اپنے اپنی غربت جیسی موٹی تاریک اور
لعنت کی گھٹا ٹوپ تاریکی کو دور نہیں کر سکتے۔

میرے خیال میں تو اپنے ملک میں کسی شخص کے لئے خودکشی کرنے کا
سب سے مؤثر اور باعزت طریقہ یہی ہے۔ کہ وہ چپکے سے ادیب بن جائے
آہستہ آہستہ وہ اپنے حصے سے درد کے اٹھائے گا کہ ایک دن موت
کی دیوی اسے خود بخود لوریاں سناتی ہوئی اپنی پرسکون آغوش
پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سو جانے کی دعوت دے دے گی۔ اس قابل
رشک موت ... کا ایک اور فائدہ یہ بھی ہے۔ کہ ایسی خودکشی کرنے
والوں کو حکومت وقت بھی نہیں روک سکتی۔ کیونکہ اس کے جمہوری آئین
میں کوئی ایسی دفعہ نہیں ہے۔ جس کی بنا پر وہ ادب کے ذریعے شہید
ہونے والوں کو اپنی قانونی گرفت میں لے سکے۔

لہٰذا اب میرے لئے اس کے سوا کوئی اور چارہ نہیں
رہا ہے۔ کہ میں اپنے بچوں کو کسی یتیم خانے میں داخل کروانے کے
بعد چپکے سے موت کو خوش آمدید کہوں۔ مگر مرنے سے پہلے میں اپنے
بچوں کو یہ وصیت ضرور کر جاؤں گا "بیٹا! چاہے تم دنیا کے کسی بھی
بڑے سے بڑے پہلوان کو للکار کر فری سٹائل کشتی لڑ لینا، خواہ
اکیلے ہی دنیا کے کسی بھی نقطے سے اونچے پہاڑ کی سب سے بلند چوٹی
کو سر کرنے کی خطرناک مہم پر چلے جانا لیکن ادیب بننے کی بیہودہ
حرکت ہرگز نہ کرنا۔ خاص کر ہندوستان جیسے ملک میں۔"

اِمتحان

میٹرک کا امتحان بن بلائے مہمان کی طرح دندناتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ اور اِدھر ہم تھے کہ ابھی ساری تیاری کرنی باقی تھی۔ امتحان میں صرف سترہ دن رہ گئے تھے۔ مگر ہمیں یہ بھی معلوم نہ تھا کہ ہماری کتابوں کے نام کیا کیا ہیں اور اُن کے مصنف کون کون ہیں۔ اپنی تیاری کی بابت ہم اتنا بھی عرض کرنا کافی سمجھتے ہیں کہ امتحان میں پاس ہونا تو درکنار ہم باعزت طریقے سے فیل بھی نہیں ہو سکتے تھے۔ روز پکا ارادہ کر کے بیٹھتے تھے کہ آج لگاتار چودہ گھنٹے پڑھ کر ہی اٹھیں گے اس سے پہلے ہرگز نہیں چاہے دنیا میں قیامت ہی کیوں نہ آجائے۔ لیکن صاحب کہاں ہم اور کہاں

دوستو میری آخری خواہش یہی ہے کہ میری موت کے بعد میری قبر پر مندرجہ ذیل کتبہ کندہ کروا دیں۔ "یہاں اپنی تمام چھوٹی بڑی تصنیفات سمیت ایک ایسا جاہل شخص مدفون ہے جس نے ادیب بننے کی خوفناک اور ذلت آمیز غلطی کی۔ خدا کرے کہ اس کی روح کو کبھی سکون نہ ملے۔"

اس ستم رسیدہ ادیب کے لرزہ خیز حشر کو دیکھ کر میں نے بھی تہیہ کر لیا ہے کہ خواہ کچھ بھی ہو جائے کم از کم اپنی زندگی میں اپنے کسی عزیز یا دوست کو ادیب بننے کی احمقانہ حرکت کبھی نہ کرنے دوں گا۔ شاعری، افسانہ نویسی، ناول نگاری وغیرہ تو بیکاروں کے شغل ہیں۔ عقل سے دور کا واسطہ رکھنے والوں کو بھی ایسی خام خیالیوں سے احتراز کرنا چاہیے۔ ادیب تو وہ شخص بنے جس نے پیدائش پر کافی روپیہ چھوڑ کر مرا ہو یا پھر اسے ڈاکوؤں کے کسی گروہ سے لوٹ مار کا ایک معقول حصہ ملتا ہو۔

پڑھائی! ہم کچھ سوچتے تھے مگر ہوتا کچھ اور تھا۔ کبھی سب بے تکلف دوست
آدھمکتے تو کبھی سینما کا پروگرام بن جاتا۔ کبھی موسم خراب ہوتا تو کبھی پڑھنے
کا موڈ نہیں بنتا تھا۔ اگر خوش قسمتی سے کبھی یہ دونوں ٹھیک ہو جاتے تھے تو
پھر صحت خراب ہو جاتی تھی۔ غرضیکہ سترہ دن یونہی بے کار گزر گئے
اور اٹھارہویں دن ہم خدا کی ان دیکھی برکتوں پر بھروسہ کر کے امتحان دینے جا
بیٹھے۔

پہلا پرچہ تاریخ کا تھا۔

پہلا سوال یہ تھا کہ قدیم آریوں کی تہذیب کے متعلق کیا جانتے
ہو۔ ہم نے جواب میں لکھا "دیکھئے صاحب۔ ہم تو اس خیال کے حامی ہیں
کہ بیسویں صدی یا زیادہ سے زیادہ انیسویں صدی سے پہلے دنیا میں کوئی
تہذیب تھی ہی نہیں۔ ہم اس سے پہلے کی تہذیب (اگر آپ کے خیال شریف
میں کوئی ہو) کو تہذیب کہہ ہی نہیں سکتے۔ بھلا آپ ہی سوچیے کہ جس زمانے
میں ہوائی جہاز، ریل گاڑیاں، موٹر کاریں، ڈرامے، ٹیلی ویژن،
ریڈیو، ٹیلیفون، سنیما، کلب، ناچ گھر وغیرہ نہیں تھے۔ اس زمانے
میں تہذیب دیکھنے کو تو کیا سونگھنے تک کو بھی نہیں مل سکتی ہوگی۔ اس سے
بہتر ہوگا کہ آئندہ تاریخ کے پرچے میں قدیم تہذیب کے متعلق
کسی قسم کا سوال نہ پوچھا جائے کیونکہ اس سے پرچہ ڈالنے والے کی نادانی
اور جہالت ظاہر ہوتی ہے۔"

دوسرا سوال خاندان غلاماں کی بابت تھا ممتحن نے پوچھا تھا

اس خاندان کا نام خاندانِ غلاماں کیوں رکھا گیا ۔ میں نے جواب میں لکھا کہ خاندان
غلاماں کے بادشاہوں کا نام دنیا کی تاریخ میں سنہری حروف میں لکھے جانے کے
قابل ہے ۔ وہ سب سے پہلے بادشاہ تھے جنہوں نے دنیا میں جمہوریت کو
شروع کروایا ۔ یہ لوگ کبھی حکمران ہو کر بھی اپنے آپ کو جنتا کا خادم
کہتے نہیں تھکتے ۔ فرعون کے نمرود خود کو زمین و آسمان کا فرق ہے ۔ خاندان غلاماں
کے بادشاہ صحیح معنوں میں عوام کے خادم یا آج کل کی زبان میں جنتا کے سیوک
تھے انہوں نے جو کچھ کہا کر کے دکھایا ۔ اسی وجہ سے انہوں نے اپنے خاندان کا
نام خاندان غلاماں رکھا ۔

اگلا سوال تھا کہ ہلدی گھاٹی میں راجپوتوں کی شکست کیوں ہوئی تھی ۔ ہم نے
جو وجہ لکھی وہ یہ تھی ۔ ہلدی گھاٹی کی لڑائی کے شروع میں راجپوتوں کا پلہ بھاری
تھا ۔ مسٹر ایک تاریخ دانوں نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ پلہ اتنا بھاری ہو
گیا تھا کہ اس کے ٹوٹ جانے کا اندیشہ ہو گیا تھا ۔ یہ مشہور زمانہ تاریخ
دان باگیشوری پرشاد لکھتا ہے " پلہ اتنا بھاری ہو گیا تھا کہ ... اور
راجپوت اس کے بوجھ کو نہ سنبھال سکے جس کی وجہ سے وہ تھک کر ... گر
گئے اور ہتھیاروں کی ہزاروں ... گئیں ۔ قریب تھا کہ مغل فوجیں شکست کھا
جاتیں ۔ لیکن ان کے ... سپاہیوں کو ایک ترکیب سوجھ گئی ۔ انہوں نے
آناً فاناً ہلدی کی سینکڑوں بوریاں منگوائیں ... ہوں کہ
... ہلدی گھاٹی " کے نام سے
بھی ظاہر ہے ۔ اور اللہ کا نام لے کر ... کر دیں ۔

اور انہیں حکم ہوا کہ وہ بہت زور سے اڑانا چھوڑ کر راجپوتوں کی آنکھوں میں جلدی جھونکنا شروع کر دیں۔ ترکیب کارگر ہوئی اور راجپوتوں کو شکست ہوگئی۔

آخری سوال لارڈ ڈلہوزی [illegible] کی بابت صاحبوں کا جواب اس وقت کھو گیا ہے۔ امید ہے اس کے لئے آپ ہمیں معاف فرمائیں گے۔

دوسرے دن جغرافیہ کا پرچہ تھا۔ سوالوں کے جواب ہم نے دیئے۔ ان کی بابت مختصراً پیش کرتے ہیں۔

سوال:۔ زمین گول کیوں ہے؟

جواب:۔ اس کی مرضی!

سوال:۔ بارش کس طرح ہوتی ہے؟

جواب:۔ جب آسمان کا دل بھر آتا ہے تو وہ رو دیتا ہے بالکل انسانوں کی طرح دراصل مگر بعض لوگ آنسوؤں کے ان قطروں کو بارش کے نام سے منسوب کر دیتے ہیں۔

نوٹ:۔ یہاں یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ اگر آسمان کی طبیعت زیادہ خراب ہو تو وہ دھاڑیں مار مار کر روتا ہے مگر عام لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ آسمان بجلی کی گرج کے ساتھ موسلادھار بارش برسا رہا ہے۔ جب کبھی تھوڑی بوندا باندی ہو پھر تو یہ سمجھنا چاہئے کہ آسمان محض شغل کے لئے یا رسمی تعزیتاً رو رہا ہے دوسرے لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ آسمان مگرمچھ کے آنسو بہا رہا ہے یا شوقیہ رو رہا ہے۔!

سوال: (ا) ہندوستان میں سب سے زیادہ بارش کہاں ہوتی ہے؟

(ب) بارش کا پانی کہاں جاتا ہے؟

جواب۔ (ا) مکانوں کی چھتوں پر۔

(ب) نالیوں میں۔

سوال: ۔ چاند گرہن کے وقت کیا ہوتا ہے؟

جواب: لوگ دان کرتے ہیں اور ساتھ ہی اشنان کرتے ہیں۔

جب ہم نے گھر آکر ان جوابوں کی تصدیق کرنے کے لئے کتاب کھولی تو فرط حیرت سے ہماری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ وہاں ہم نے پڑھا کہ بارش سورج کی گرمی سے پیدا شدہ بخارات کی وجہ سے ہوتی ہے نہ کہ ہماری "آسمان کے آنسو" والی تھیوری کے مطابق ہندوستان میں سب سے زیادہ بارش مکانوں کی چھتوں پر نہیں بلکہ آسام میں چراپونجی کے مقام پر ہوتی ہے۔ اور بارش کا پانی نالیوں میں نہیں بلکہ ندی نالوں کے ذریعے سمندر میں جا پہنچتا ہے اور کچھ زمین میں جذب ہو جاتا ہے۔ ہمیں یہ بھی پتہ چلا کہ ہمارا چاند گرہن کے سوال کا جواب بھی غلط ہے۔ کیونکہ ممتحن کا اس سوال سے منشا یہ تھا کہ چاند گرہن کے وقت زمین، سورج اور چاند کی کیا حالت ہوتی ہے؟ اور اس کا جواب یہ تھا کہ یہ تینوں گرہن کے وقت ایک دوسرے کی سیدھ میں آ جاتے ہیں نہ کہ "لوگ اس وقت دان کرتے ہیں اور ساتھ ہی اشنان کرتے ہیں"۔ کتاب میں جوابات پڑھ کر ہمارے تعلیمی ذوق کو شدید

لگتیں لگی کیونکہ کتاب میں لکھے ہوئے جوابوں کی نسبت ہمارے جواب زیادہ معقول ہوتے۔ اس سے اس دن سے جغرافیہ کی کتاب پر سے ہی نہیں بلکہ علم جغرافیہ پر سے بھی ہمارا یقین اٹھ گیا ہے۔

ہمارا نقشہ کھینچنے کا سوال بھی بہت غلط طور سے حل ہوا تھا۔ نقشے میں ریلوے لائن، دریا اور نہریں کچھ عجیب طرح سے خلط ملط ہو گئی تھیں۔ دیکھنے سے پتہ چلتا تھا کہ ریلوے لائن جو دہلی سے کلکتہ جاتی تھی وہ کلکتہ سے ہوتے ہوئے خلیج بنگال میں جا گری تھی۔ گنگا دریا بعض شہروں کے درمیان سے گزر رہے تھے لیکن دریا موڑ کا رخ ہی بدل گیا تھا۔ بعض میدانوں میں نئے پہاڑ ابھر آئے تھے۔ جس جگہ کپاس کی کاشت ہوتی تھی وہاں ہم تمباکو لکھ آئے تھے۔ جہاں پٹ سن ہوتی تھی وہاں ہم ربڑ کے درخت اگا آئے تھے اور سب سے سنگین غلطی ہم سے یہ ہوئی کہ ایک صحرائی علاقہ میں آم کی فصل لگا آئے تھے۔

ان سب باتوں کو دیکھ کر ہمیں تو یقین پیدا ہو گیا تھا کہ ہمیں پنجاب یونیورسٹی ہمیں یا تو ہماری اعلیٰ سوجھ بوجھ کے صلے میں جغرافیہ کی بجائے ایک نیا جغرافیہ لکھنے کی دعوت ضرور دے دے گی!

اس کے بعد حساب اور اس کے ساتھ ہی یعنی الجبرا اور جیومیٹری کا امتحان تھا۔ دنیا کے تمام خشک مضامین میں سب سے زیادہ خشک ہمیں یہی حساب اور اس کے خاندان (الجبرا جیومیٹری وغیرہ) سے ہے۔ اپنا خیال تو یہ ہے کہ ایک عام آدمی کا .... کا علم حساب سے متعلق اتنا بھی

ہونا کافی ہے۔ کہ وہ رقموں کو جمع و تفریق اور تقسیم کرسکے۔ وہ اپنی تنخواہ
کا حساب رکھ سکے اور کسی دوکاندار کو نوٹ دے کر باقی ریزگاری ٹھیک طرح
سے گن کر لے سکے .... مگر کوئی ذواضعاف اقل اور کسر اعشاریہ کا
نام لیتا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم جیسے خطرناک اور لاعلاج بیماریوں
کے نام سن رہے ہیں۔ اور دیکھئے .... لفظ الجبرا کس قدر
دہشت ناک ہے۔ الجبرا کا نام سنتے ہی جسم میں ایک قسم کی کپکپی چھڑنے
لگ جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ریچھ یا بھالو کی قسم کا کوئی خوفناک
درندہ اپنے بھیانک جبڑے کھولے ہوئے ہمیں نگلنے کے لئے اپنی طرف
لپکتا ہوا چلا آرہا ہے۔

اس کے بعد جیومیٹری کا امتحان تھا۔ انگریزوں کے چلے جانے کے سبب
کی بدولت ہم اس مضمون کو پڑھنا غیر ضروری اور فالتو سمجھتے تھے۔ اس لئے
ہم نے اس مضمون کی طرف توجہ دینی ہی چھوڑ دی ہے۔ اس مضمون کے
پرچے ہم نے کیسے حل کئے ہوں گے۔ اس کی بابت آپ خود ہی بہتر اندازہ
لگا سکتے ہیں۔

اس کے بعد اردو کا امتحان آیا۔ چونکہ یہ ہمارا پسندیدہ مضمون ہے
اس لئے ہم اس کے پرچے نہایت ہی صحت و احتیاط طریقے سے حل ہو سکے تھے
پہلے سوال میں چند محاورات کی کردہی عبارت دی ہوئی تھی اور باقی کی ہمیں
لکھنی تھی۔ ہم سمجھ نہیں اسے پڑھا۔

نہ تیلی دیکھو .... تیل کا دھار دیکھو۔

۲- نہ نو من تیل ہوگا .... نہ پکوڑے تل ہونگے۔

۳- ایک کریلا .... اور وہ بھی سڑا ہوا

۴- بغل میں چھری .... منہ میں خوش آمدید

۵- ناچ نہ جانے .... چلے کلب کو

دوسرا سوال یہ تھا کہ تم خواجہ حالی کی بابت کیا جانتے ہو۔ نیز ان کی شاعری پر مختصر روشنی ڈالو۔ اس سوال کا جواب یوں دیا گیا۔ خواجہ حالی دراصل دوکانداری کرتے تھے جیسا کہ ان کے اپنے ہی ایک شعر سے ظاہر ہے۔

حالی ہے نایاب پر گاہک ہیں اکثر بے خبر
شہر میں کھولی ہے حالی نے دکاں سب سے الگ

اس کے اس شعر سے صاف ظاہر ہے کہ خواجہ حالی ایک کہنہ مشق اور تجربہ کار دوکاندار تھے اور شاعری تو ان کا مشغلہ تھا جب وہ تنہا شعر کہا کرتے تھے۔

ان کی شاعری کی بابت عرض ہے کہ سب سے پہلے اور سب آخر میں ان کا تخلص پسند نہیں ہے۔ حالی ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے خالی ہو۔ ویسے بھی یہ دونوں الفاظ ہم وزن ہیں۔ بہتر ہوتا کہ وہ اپنا تخلص مالی رکھ لیتے تاکہ ان کے حالی تخلص کی وجہ سے ان کے شعروں میں جو خالی پن آ گیا ہے۔ اس کی کمی مالی تخلص رکھنے سے پوری طرح دور ہو جاتی۔ خود آپ خیال تو کیجیے کہ اگر کسی شخص کا تخلص

مالی ہو تو ہمیں خواہ مخواہ یقین ہونے لگتا ہے کہ اس شخص کی شاعری میں منظر پر پھولوں کی رنگینی، شوخی اور لطافت موجود ہوگی۔ بادِ بہاری کی اٹکھیلیاں ہوں گی۔ اور بھنورے اور تتلیوں کا رقص ہوگا وغیرہ وغیرہ۔

آخری سوال جواب مضمون کا تھا۔ ہم نے جو مضمون منتخب کیا اس کا عنوان تھا "امتحان ۔۔۔۔۔۔ اس کے فائدے اور نقصانات"۔ پہلے تو ہم نے چند فقروں میں امتحان کی تشریح کی اس کے بعد امتحانوں کے مندرجہ ذیل چند فائدے بیان کیے۔

گھر والے کوئی کام کرنے کو نہیں کہتے۔ اگر وہ غلطی سے کہہ بھی دیں تو بلاشک آپ پر ٹیسٹ سوار ہو اور انہیں آنکھیں دکھا کر کہو۔ "دیکھتے نہیں میرا امتحان ہونے والا ہے"۔ پتہ نہیں ان الفاظ میں کیا جادو ہے کہ انہیں سنتے ہی گھر والے دُم دبا کر بھاگ جاتے ہیں۔ شاید وہ سمجھتے ہیں کہ برخوردار کا امتحان نہیں بلکہ کوئی خطرناک آپریشن ہونے والا ہے۔ اس لیے اسے کسی کام کرنے کی بابت نہیں کہنا چاہیے یا کوئی ایسی سخت بات نہیں کہنی چاہیے جس سے کہ اس کی صحت پر برا اثر پڑے۔

۲۔ امتحان دینے والے کی ٹھیک اسی طرح خاطر تواضع کی جاتی ہے جیسے کسی معزز شخص کی مقدمے میں گواہی دینے جاتا ہو۔ گھر والے اسے طرح طرح کے لالچ دیتے ہیں جیسے کہ اگر تم امتحان میں پاس ہو گئے تو تمہیں یہ دیں گے، وہ لے دیں گے وغیرہ

سے کشمیر کلب میں گئے وغیرہ وغیرہ ۔

۱۲ - اگر امتحانوں کا کاروبار نہ ہو تو دنیا کی تمام یونیورسٹیوں کے دیوالے نکل جائیں اور پرچے بنانے والے اور پرچے دیکھنے والے پروفیسروں اور ماسٹروں کی آمدنی کا معقول ذریعہ ختم ہو جائے ۔

۱۳ - اگر امتحان نہ ہوں تو ٹیسٹ پیپر اور خلاصے لکھنے والے ماہر نباضِ عالم پروفیسروں کو زبردستی بھوک ہڑتال کرنی پڑ جائے ۔

یہ تو تھے امتحان کے فائدے ۔ اب ذرا اس کے نقصانات کے بارے میں بھی سن لیجئے ۔

۱ - امتحان ایک طرح کا وبائی مرض لاتا ہے جسے عام اصطلاح میں "امتحانی بخار" کہتے ہیں ۔ امتحان کے دنوں میں ہیڈ ماسٹروں اور پرنسپل صاحبان کے پاس اس بیماری کا شکار ہونے والے مریضوں کی اکثر عرضیاں آتی ہیں ۔ یہ بخار صرف طالب علموں کو ہی ہوتا ہے ۔ دودھ پیتے بچے بھی اس کی گرفت میں آ جاتے ہیں ۔ اس بخار کی تاثیر مختلف ہوتی ہے ۔ مریض کو بظاہر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھلا چنگا ہے

۲ - امتحان دینے والوں کی دماغی طاقت تو قدرے بڑھتی ہیں مگر جسمانی نشو و نما بالکل بند ہو جاتی ہے ۔ امتحانوں کی وجہ سے دنیا کی مجموعی صحت پر نہایت ہی برا اثر پڑا ہے ۔ ہماری انسانیت کا جتنا خون امتحانوں نے چوسا ہے اتنا تو شاید دنیا کی پہلی اور دوسری دونوں عظیم جنگوں نے بھی نہ چوسا ہوگا ۔ امتحانوں کے آنے پر بڑے

افرات کو دیکھ کر ہندوستان کے مشہور شاعر جناب غالب نے فرمایا ہے

امتحان نے غالب نکما کر دیا ۔ ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

پہلے تو لوگ کہتے تھے کہ تم تو ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گئے ہو

مگر آج کل سننے میں آتا ہے کہ تم تو امتحان کی طرح میرے پیچھے پڑ گئے ہو

جتنی تکلیف اور ایذا طالب علموں کو امتحان سے ہوتی ہے وہ بیچارے معصوم طالب علم ہی جانتے ہیں ۔ امتحانوں کی اسی تکلیف سے تنگ آ کر عزیز طالب علم شاعر جناب طوق نے فرمایا ہے ۔

اے طوق امتحاں میں ہے تکلیف سراسر

ہیں آرام سے وہ جو امتحان نہیں دیتے

حضرت یسوع مسیح نے بھی فرمایا ہے کہ " اے خدا مجھے ہر قسم کی مصیبت میں ڈال دینا لیکن امتحان کی مصیبت میں میرے دشمن کو بھی نہ ڈالنا " اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انسانیت کے اتنے بڑے پیامبر کو بھی امتحانوں کا تلخ تجربہ ہو چکا ہے اور وہ بھی اس سے پناہ مانگتے تھے ۔

غرضیکہ امتحان ایک مصیبت ہے ایک وبا ہے ایک لعنت ہے اس سے چھٹکارا حاصل کی ہر ممکن روک تھام ہونی چاہیئے امتحان میں بڑی بڑی ہستیوں کے چھکے چھوٹ جاتے ہیں ۔ پتہ نہیں ابھی تک انجمن اقوام متحدہ کی توجہ امتحانوں کے خاتمے کی طرف کیوں نہیں دی گئی ہمارے خیال میں تو تمام سکولوں اور کالجوں کی یونیورسٹیوں سے پرینیڈنٹ صاحبان کو چاہیئے

کو امتحانوں کے مکمل خاتمہ کے بارے میں قرارداد دیں پاس کر کے یو۔ این۔ او۔
کے پاس اس التجا کے ساتھ بھیج دیں کہ اس ریزولیوشن کو اتحادی سبھا کے ایجنڈہ
میں سب سے پہلے رکھیں کیونکہ دنیا کو اس وقت جو سب سے بڑا خطرہ درپیش
ہے۔ وہ تیسری بڑی جنگ کا نہیں بلکہ امتحانات کے مسئلہ کا ہے۔

ہمیں امتحان کے خلاف صرف ریزولیوشن پاس کر کے ہی آرام سے
نہیں بیٹھ جانا چاہیے بلکہ ہمیں نہایت مستعدی سے کام لیتے ہوئے امتحان
کے خلاف دنیا کے طلبا کی رائے عامہ کو بیدار کرنا چاہیے تاکہ وہ سب ایک
آواز ہو کر اپنے مطالبہ کے لیے ڈٹ جائیں۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے
دنیا کے تمام طالب علموں کے نمائندوں کی ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد
ہونی چاہیے اور دنیا کے تمام ملکوں میں جلوس اور جلسے ہونے چاہئیں
ان جلوسوں میں کچھ اس قسم کے نعرے لگنے چاہئیں " نہیں دیں گے
امتحان " ختم ہو کے رہے گا .... " امتحان " چاہے نکل جائے
ہماری جان .... نہیں دیں گے امتحان "

ہماری شادی

--- یوں تو ہماری شادی کا معاملہ ایک طویل عرصے سے دوست احباب اور رشتہ داروں کے لئے گفتگو کا موضوع بنا ہوا تھا مگر پچھلے سال تو یہ خطرناک طور پر شدت اختیار کر گیا۔ جو کوئی ملتا رسمی طور پر حال چال پوچھنے کے بعد شادی کے متعلق تذکرہ چھیڑ دیتا۔ کوئی دوست ملتا تو کہہ دیتا کہ تم کیوں اب شادی عمر بھر بن بیاہا رہنے کا ارادہ ہے چھبیس سال کے تو ہو چکے اب کون سے وقت کے انتظار میں ہو کیا عیگر منیہ نسل کی طرح چوراسی سال کی عمر میں شادی کرنے کا ارادہ ہے؟ کوئی رشتہ دار ملتا تو کہتا "واہ بھئی خوب انتظار کروا رہے ہو۔ اپنی شادی کے لئے ہمارے دوستوں کے تو تین تین بچے ہو چکے ہیں۔ مہمان کے بچے سے پیار جائیں گے تو کیا اس وقت شادی کرو گے۔

کو امتحانوں کے مکمل خاتمے کے بارے میں قرارداد دیں پاس کر کے یو این او کے پاس اس التجا کے ساتھ بھیج دیں کہ اس ریزولیوشن کو اقوامی سبھا کے ایجنڈا میں سب سے پہلے رکھیں کیونکہ دنیا کو اس وقت جو سب سے بڑا خطرہ درپیش ہے۔ وہ تیسری جنگ کا نہیں بلکہ امتحانات کے مسئلہ کا ہے۔

ہمیں امتحان کے خلاف صرف ریزولیوشن پاس کر کے ہی آرام سے نہیں بیٹھ جانا چاہیئے بلکہ ہمیں نہایت مستعدی سے کام لیتے ہوئے امتحان کے خلاف دنیا کے طلباء کی رائے عامہ کو بیدار کرنا چاہیئے تاکہ وہ سب ایک آواز ہو کر اپنے مطالبہ کے لئے ڈٹ جائیں اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے دنیا کے تمام طالب علموں کے نمائندوں کی ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد ہونی چاہیئے اور دنیا کے تمام ملکوں میں جلوس اور جلسے ہونے چاہئیں ان جلوسوں میں کچھ اس قسم کے نعرے لگنے چاہئیں "نہیں دیں گے امتحان" "ختم ہو کے رہے گا...... امتحان" "چاہے نکل جائے ہماری جان ...... نہیں دیں گے امتحان"

ہماری شادی

--- یوں تو ہماری شادی کا معاملہ ایک طویل عرصے سے دوست احباب اور رشتہ داروں کے لئے گفتگو کا موضوع بنا ہوا تھا۔ مگر پچھلے سال سے تو یہ خطرناک طور پر شدت اختیار کر گیا۔ جو کوئی ملتا رسمی طور پر حال چال پوچھنے کے بعد شادی کے متعلق تذکرہ چھیڑ دیتا۔ کوئی دوست ملتا تو کہہ دیتا کہ تم کیوں اب شادی عمر بھر برہمچاری رہنے کا ارادہ ہے۔ چھبیس سال کے تو ہو چکے اب کون سے وقت کا انتظار ہے۔ کیا برٹرینڈ رسل کی طرح جو اسی سال کی عمر میں شادی کرنے کا ارادہ ہے؟ کوئی رشتہ دار ملتا تو کہتا "تمہاری بیوی تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ اپنی شادی کے لئے ہمارے دوستوں کے تو تین تین بچے ہو چکے ہیں۔ جب ان کے پوتے پیدا ہو جائیں گے تو کیا اس وقت شادی کرو گے۔

میرے خیال میں یہی وقت شادی کے لئے نہایت موزوں ہے تاکہ لوگ
تمہارے بوڑھے چہرے پر سہرا بندھا ہوا دیکھ کر بے اختیار پکار اٹھیں ۔
"بوڑھی گھوڑی لال لگام"

ایک اور بے تکلف دوست ۔ یہ تو فرماتے "۔ ارے یار تمہارے
دوستوں کی دھڑا دھڑ شادیاں ہو رہی ہیں ۔ مگر تم ایسے ڈھیٹ ہو کہ
تمہیں سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی رتی بھر شرم نہیں آتی ۔ اگر تم لڑکی کو
باقاعدہ برات لے جا کر پھیرے دلوا کر نہیں لا سکتے تو کسی کو ویسے ہی بھگا
کر لے آؤ ۔ ہم سمجھ لیں گے کہ تمہاری شادی ہو گئی ۔ اور وہ بھی بغیر کسی خرچ
کے ہی ۔

ایک اور قریبی رشتہ دار اپنے مخصوص انداز میں ناک سے آواز نکال
کر فرماتے "میرے خیال میں تو اب بیسویں صدی میں تو تمہاری شادی ہونے
سے رہی ۔ انیسویں صدی کا کوئی سا ہو بلکہ اٹھارہویں صدی میں اگر
شادی ہو جاتی تو بہت اچھا تھا ۔ مگر اب تم شادی کے لئے مقرر شدہ دن کا خیال کرو گے
تو دل کو تسلی ملتی رہے گی "۔ ہماری برادری کی ایک سفید بالوں والی
خاتون جب کبھی ملتیں ۔ یہی فرماتیں ۔ "بیٹا خود دار ۔ تمہارے سے سنجوگ
تو بیت ہی چکے ہیں ۔ یہاں دوسرے لوگوں کے سنجوگ ہوائی جہاز کی طرح تیزی
سے اڑتے ہیں تو تمہارے سنجوگ سست رفتار اور اڑیل
بیل کی طرح چھکڑے کی طرح آگے بڑھنے کا نام ہی نہیں لیتے
لگتی ہے دعا تمہیں ہم بھی کہ تم ایک بار اتار کے دن کی مشعل ہی

دو جوڑیاں اکھاڑے چڑھا کر تو دیکھو کہ تمہارا بیاہ کتنی جلدی ہوتا ہے
مگر آج کل کی نئی تعلیم نے تمہارے دماغ کو اس قدر خراب کر دیا ہے
کہ تم میری بات کو وہم سمجھ کر اسے مانتے ہی نہیں۔"

ہم اپنے ملنے جلنے والوں کو بہترا سمجھاتے کہ دیکھو لوگ کہتے ہیں کہ
مصیبت اکیلی نہیں آتی۔ بلکہ اپنی تفریح طبع کے لئے اپنی کئی سہیلیوں کو بھی
ساتھ لے آتی ہے اسی طرح شادی کے متعلق ہمارا خیال یہ ہے۔ کہ بیوی جب
بھی آتی ہے اکیلی نہیں آتی۔ بلکہ اپنے دل بہلاوے کے لئے کافی بال بچے بھی
ساتھ لے آتی ہے۔ اگرچہ یہ بچے شادی کے کچھ عرصہ بعد باری باری اپنے
ننھے ننھے مکھڑے دکھلانا شروع کرتے ہیں۔ مگر آتے تو بیوی صاحبہ کی ہی
وجہ سے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں مجرد شخص کی زندگی کتنی پرلطف اور سکون
آمیز ہے۔ نہ بیوی بچوں کا جھگڑا۔ نہ راشن پانی کا فکر۔ جب چاہو گھر
واپس آجاؤ اور جب چاہو گھومنے پھرنے کے لئے باہر نکل جاؤ۔ کوئی روکنے
ٹوکنے والا نہیں۔ مگر بیوی اور بال بچوں والوں کو یہ آزادی کہاں۔ بس سائیکل کے
پہیے کی طرح گھر سے دفتر اور دفتر سے گھر۔ اگر کہیں ایک آدھ گھنٹہ کے لئے
اِدھر اُدھر ہو جاؤ تو تفتیش شروع ہو جاتی ہے۔ اور پھر اپنی صفائی
کا بیان دو اور جھوٹی سچی قسمیں کھاؤ تب جا کر کہیں چھٹکارا نصیب
ہوتا ہے اور پھر چھبیس ستائیس سال کی عمر بھی کوئی عمر ہوتی ہے ہمارے
شاستروں میں تو پچیس سال کی عمر کے بعد ہی شادی کروانے کو
فرماتے ہیں شادی کروانے کی اصل عمر تو ہمارے حساب سے جبکہ آدمی ساٹھ کا

پیدا ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ کے ملکوں میں شادیاں عموماً پچیس تیس سال کی
عمر میں ہوا کرتی ہیں۔ کیونکہ اس عمر میں آدمی زیادہ سمجھدار، وسیع النظر اور تجربہ کار
ہو کر گھر گرہستی کے اس بوجھ کو سنبھالنے کے قابل ہوتا ہے۔

مگر ہمارے والدین کے کانوں پر کوئی اثر نہ ہوا۔ لوگوں کو ایسی باتیں کرتے دیکھ کر
ہمیں یہ شک ہی نہیں بلکہ پختہ یقین ہو گیا کہ اس وقت دنیا کے سامنے سب سے
بڑا مسئلہ امن عالم کے قیام کا نہیں بلکہ ہماری شادی کا ہے۔ اس خیال
کے آنے پر ہم نے بھی یہ فیصلہ کر لیا کہ اگر اپنے والدین نہیں تو کم از کم دنیا کا منہ
بند کرنے کے لئے اب شادی کر ہی ڈالیں۔ آخر ہم نے گھر والوں کو یہ الٹی
میٹم لکھ کر بھیج ہی دیا۔ "اگر آپ نے آج سے ٹھیک دو ماہ کے
اندر اندر ہماری شادی نہ کروائی تو ہم یقیناً کسی نہ کسی لڑکی کو اغوا کر کے
لے ہی آئیں گے۔ پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی۔" اس سنسنی خیز الٹی میٹم کو
پڑھ کر ہمارے گھر والوں کے ہاتھوں کے ہاتھی اڑ گئے۔ کیونکہ طوطے
بیچارے تو بہت ہی حقیر اور چھوٹے سے جانور ہیں۔ اور اگر وہ کسی کے
ہاتھوں سے نکل جائیں تو اتنا افسوس نہیں ہوتا جتنا کہ ہاتھی نکل جانے کا۔
ہمارے گھر والے خواب میں بھی نہیں سوچ سکتے تھے کہ ہم جیسا معصوم بے
خبر اور امن کا پجاری انسان اتنا خطرناک اور انقلابی اقدام اٹھا سکتا
ہے۔

قصہ کوتاہ پندرہ دن کے اندر اندر ہماری منگنی ہو گئی اور الٹی میٹم میں
ہی تحریر شدہ دو ماہ کے عرصہ کی بجائے ایک مہینے کے اندر اندر ہماری شادی

ہو جو تھی۔ خوش قسمتی سے لڑکی بھی اچھی خوبصورت اور ذہین ملی۔ اگرچہ سابقہ حالات کے پیش نظر ہمیں تو اندھی۔ کانی۔ لولی لنگڑی یعنی جیسی بھی ملتی منظور تھی۔ ہمیں تو فقط لڑکی نام کا جنس کا ایک عدد دانہ چاہیئے تھا۔ وہ بھی لوگوں کی زبان کو علی گڑھ کا پختہ تالا لگانے کے لئے۔

خیر ہماری شادی ہو گئی اور ہوئی بھی کمال دھوم دھام اور شان و شوکت سے۔ ہماری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے ہم نے پانی پت کی چوتھی لڑائی (کیونکہ پہلے تین ہو چکی ہیں) جیت لی ہو۔ اگر شادی دنیا کی تاریخ کا اہم واقعہ نہیں۔ تو کم از کم ہندوستان کی تاریخ کا ناقابل فراموش واقعہ ضرور قرار دیا جا سکتا ہے۔ بارعب وردی پہنے بڑے باجے بجانے والوں کو پیچھے اور قیمتی پوشاکیں پہنے ہوئے براتیوں کے آگے ایک لیڈر میں ساز و سامان سے آراستہ پیراستہ گھوڑے پر بیٹھے ہوئے ہم اپنے آپ کو ایک ایسے فاتح جرنیل تصور کر رہے تھے۔ جس کو نہایت شاندار فتح پانے پر فوجی بینڈ کے پیچھے اور بارعب وردی میں ملبوس فوجوں کی قطاروں کے آگے پوری شان و شوکت سے گھوڑے پر سوار کروا کے اس کے اعزاز میں شاندار جلوس نکالا جاتا ہے۔ براتیوں کے آگے جو پٹاخے چلائے جا رہے تھے ان کے دھماکوں کی وقعت ہمارے لئے سلامی کے وقت توپوں کے گولوں کی گرج سے کم نہیں تھی۔ ہمیں بیوی کے ملنے کی اتنی خوشی نہیں ہو رہی تھی جتنی کہ لوگوں کی زبانیں بند ہونے کی تھی۔

مگر افسوس کہ ہماری یہ خوشی دیرپا ثابت نہ ہوئی جب ہماری شادی

ہوئے ڈیڑھ سال گزر گئے تو دوستوں واقف کاروں اور رشتہ داروں نے اولاد کے متعلق پوچھنا شروع کر دیا۔ جو کوئی بھی ملتا بڑی حیرانی سے کہتا۔ ”ارے! شادی کو دو سال ہو گئے۔ مگر بچہ ایک بھی پیدا نہ ہوا۔ اچھے مرد ہو!“۔ یہ کہہ کر وہ ہماری طرف ایسی نگاہوں سے دیکھتا۔ جیسے اسے ہماری حالتِ زار پہ بے اختیار ترس آ رہا ہے۔ ہم بہتیرا سمجھاتے کہ اے بندۂ خدا! کیا ہوا جو ہمارے ہاں کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا۔ آگے ہی کیا سندھ میں بچوں کی کوئی کمی ہے جو ہم ان کی تعداد میں برساتی مینڈکوں کی طرح اضافہ کرتے رہیں۔ کیا تم چاہتے ہو کہ پہلے کی طرح ایک دفعہ پھر اناج کے کنٹرول کا خوفناک بھوت ہمارے سروں پر منڈلانے لگے۔ کیا تم چاہتے ہو کہ ہم بے تحاشہ بچے پیدا کر کے ملک میں پھیلی ہوئی بھیانک بے کاری کو اور بھی بڑھا دیں؟“

ہماری یہ باتیں سن کر دوسرے صاحب بڑے طمطراق سے فرماتے ”بھلا تمہارے بچے نہ پیدا کرنے سے ملک کی آبادی میں کون سی کمی ہو جائے گی۔ تم زیادہ سے زیادہ چار نہیں تو پانچ بچے پیدا کرو گے۔ اس سے بڑھ کر اور کون سا تیر مار لو گے۔ کتنا راشن بچا لو گے ملک کا۔ کتنی کمی کر دو گے بے کاری میں؟“

”چاہے پانچ چھوڑ میں دس بچے پیدا کروں“ ہم نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”مگر سوال ہمارا تمہارا نہیں۔ اصول کا ہے۔ اگر ہماری طرح اور لوگ بھی برتھ کنٹرول کے اصولوں پر عمل کریں تو وہ ملک کی بہترین خدمت

کر سکتے ہیں۔ سب لوگوں کی مشترکہ کوششوں سے ہی کامیابی مل سکتی ہے۔"

مگر دوسرے صاحب کو ہماری باتیں پسند نہ آئیں۔ اور بعض دفعہ تو وہ مجھ سے ہاتھ ملائے بغیر ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتے ہوئے اپنی بتیسیاں نکالتے ہوئے اپنا راستہ ناپتے ہوئے نظر آتے۔

ایک اور صاحب ملے۔ اور یوں فرمانے لگے۔ "حضور رہ گئے۔ ابھی آپ ایک بچہ بھی پیدا نہیں کر سکے۔ میری طرف دیکھیے۔ میرے بیاہ کو صرف چار سال ہوئے ہیں مگر نو بچے ہیں اور وہ بھی سب زندہ۔" یہ سن کر مجھے آپ کے کانوں کی صحت پر شک ہونے لگا۔ گھبراتے ہوئے پوچھا "چار سال میں نو بچے؟"

"جی ہاں! وہ بھی سب زندہ ہیں۔" انہوں نے با آواز بلند اعلان کیا

حیرانی کے عالم میں ہمارے منہ سے بے اختیار یہ الفاظ نکل گئے۔ "تو کیا یہ سب آپ کے ہی بچے ہیں؟"

"میرے نہیں تو کیا آپ کے ہیں" انہوں نے مجھے گھورتے ہوئے کہا

"کیا مطلب ہے جی آپ کا؟" "مطلب یہ ہے ...."

کہ یہ سب بچے آپ کے ہی ہیں یا آپ کی بیوی صاحبہ اس سے پہلے سے ناشادی شدہ تھیں؟

"دیکھیے میرا مطلب یہ ہے کہ کبھی ہماری بیوی نے دو دو بچوں کو ایک ساتھ جنم دیا اور کبھی تین تین کو۔"

ان کا یہ سننا تھا جیسے خواب سن کر ہمیں بے اختیار اپنی پچھلی سالی اُس کُتیا کی یاد آ گئی۔ جس نے چھ پلّوں کو ایک ساتھ جنم دیا تھا۔

مگر جب ہماری شادی کے بعد تین سال گزر گئے۔ تو ہمیں بچے کی فکر نہ

پیدا نہ کرنے کے ارادے کو بدلنا بھی پڑا۔ شادی کے معاملے کی طرح اب ہمارے
بچے نہ پیدا ہونے پر لوگ طرح طرح کی باتیں بنا رہے تھے۔ ہندوستان بھی
خوب ملک ہے۔ اگر یہاں کسی شخص کے ہاں اس کے بیاہ کے ٹھیک نو مہینے بعد کوئی
بچہ پیدا نہ ہو تو اکثر لوگ اس کی قوت مردمی پر بھی شک کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

تین چار مہینے گزرنے کے بعد ہم نے نہایت فخر سے اعلان کرنا
شروع کر دیا کہ بفضل خدا ہمارے ہاں بھی بچہ پیدا ہونے والا ہے۔ یہ سن
کر ہمارے کئی دوستوں، واقف کاروں اور رشتہ داروں کی حیرانی کی
کوئی حد نہ رہی کیونکہ وہ ہمیں "ناکارہ" سمجھ کر ہمارے ہاں بچہ پیدا ہونے
کی کبھی امید بھی چھوڑ چکے تھے۔ انہیں اس وقت تک ہماری بات پر یقین
نہ آیا جب تک کہ انہوں نے خود ہمارے گھر پر آنے والی نرس اور لیڈی
ڈاکٹر سے اس امر کی تسلی نہ کر لی۔ بس اب کیا تھا۔ چپکے لگی مبارکباد دینی
شروع ہو گئیں۔ ایک دوست صاحب سے ہم نے مبارکباد دینے کی وجہ پوچھی تو
فرمانے لگے۔ فارسی زبان کی ایک کہاوت ہے "زمین جنبد نہ جنبد گل محمد"
یعنی زمین ہل گئی لیکن گل محمد صاحب اپنی جگہ سے نہیں ہلے۔ جب سے یہ
مبارکباد نہیں ادھر سے "مطلب یہ ہے کہ آج ایک گل محمد اپنی جگہ سے ہل گیا
ہے۔ یعنی اس نے اپنے بچے نہ پیدا کرنے والے ارادے کو بدل دیا ہے
اور اس کے بھی بچہ پیدا ہونے کی امید ہے!"

"یہ بات نہیں تھی" ہم نے ہنستے ہوئے کہا "میں تو صرف یہ چاہتا
تھا کہ اپنی حیثیت کے مطابق مناسب وقت پر بچے پیدا کرنے چاہئیں۔"

"اجی چھوڑیئے آپ اس فضول کی نصیحت بازی کو" ہمارے دوست فرمانے لگے۔ ہونے دو جو ہوتا ہے بچے تو خدا کی دین ہیں۔ جو پیدا ہوتا ہے وہ کسی نہ کسی طرح پیٹ بھر ہی لیتا ہے"۔

"جی ہاں! چاہے اسے گندگی کے ڈھیر سے ہی کیوں نہ خوراک ڈھونڈنی پڑے"۔ ہم نے ان پر طنز سے بھرپور ایک اور وار کرتے ہوئے کہا۔ وہ اس چوٹ کی شدت کو برداشت نہ کر سکے۔ اور بات کا رخ پلٹاتے ہوئے کہنے لگے اچھا یہ تو بتاؤ۔ کہ تمہارے ہاں لڑکا پیدا ہو گیا یا لڑکی؟"

"بھلا میں یہ کیسے بتا سکتا ہوں قدرت کی مرضی ہے چاہے لڑکی ہو جائے یا لڑکا ہو"

"ارے یار لڑکے کی دعائیں مانگو۔ اگر لڑکی پیدا ہوئی تو مفت کی ڈنگ بھرنی پڑے گی۔ میں تو خدا سے ہمیشہ یہی دعا کرتا رہا ہوں کہ میرے گھر لڑکی کو پال کر پوس لے پڑھاؤ لکھاؤ اور جب وہ جوان ہو جائے تو پھر اس کے بیاہ کے لئے موزوں ور ڈھونڈو اور جہیز اکٹھا کرنے کی فکر میں خود کو غرق کرتے پھرو۔

"خدا بچائے ایسی منحوس جنس سے"۔

"بڑے افسوس کی بات ہے" ہم اپنے دوست کی پست ذہنیت کا ماتم کرتے ہوئے بولے۔ "کہ آپ جیسے پڑھے لکھے آدمی بھی لڑکیوں کو منحوس خیال کرتا ہے۔ رہنے نہیں آپ جیسے لوگ۔ یہ کیوں بھول جاتے ہیں۔ کہ اگر یہ "منحوس" جنس دنیا میں نہ ہوتی تو آپ لوگ بھی اپنی ماں کی کوکھ سے جنم لے کر یوں ہر گز

اس دنیا میں تشریف نہ لاتے۔ باقی رہا جہیز کا سوال تو یہ آپ کی اپنی بنائی ہوئی رسم ہے۔ خدارا تم ضرور جہیز دو۔ اگر آپ کو یہ رسم بری لگتی ہے تو نہ آپ اپنے لڑکوں کے بیاہ میں جہیز لیں۔ اور نہ اپنی بہنوں اور لڑکیوں کے بیاہ میں جہیز دو۔“

”ارے بھائی تم تو بات بات پر نصیحت کے لیکچر دینے لگ جاتے ہو۔“ ہمارے دوست کھسیانی سی ہنسی ہنس کر موضوع کو پھیر لیتے ہوئے اور کہنے لگے ”مگر میں یہ شرط لگا سکتا ہوں۔ کہ تمہارے ہاں لڑکی ہی پیدا ہوگی۔“

”وہ کیسے؟“

”کیوں کہ اپنا تجربہ یہی کہتا ہے۔ تمہارے جیسے نصیحت بازوں اور نرم دل لوگوں کے ہاں لڑکیاں ہی پیدا ہوتی ہیں۔

لڑکے تو ہم جیسے مرد ہی پیدا کر سکتے ہیں۔ اگر یقین نہ آئے تو لگا لو شرط۔“

”چلو لگ گئی۔“

”کتنے کی؟“

”جتنے کی تم کہو۔“

”پچاس پچاس روپے کی سہی۔“

”منظور!“ ہم نے اپنے دوست کے ہاتھ پہ ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

ہم دونوں میں لگی ہوئی اس شرط کی بابت سن کر ہمارے کئی دوستوں

اور واقف کاروں کی بھی آپس میں کئی شرطیں لگ گئیں ۔ [illegible] کی مجموعی رقم کئی ہزار
کی تعداد تک جا پہنچی ۔ کوئی کہتا تھا لڑکی ہو گی اور کوئی لڑکا ۔ روز بروز بحث
تیز ہوتی رہی ۔ نئی نئی شرطیں لگتی رہیں ۔ پرانی شرطوں کی رقم بڑھتی رہی اور
ہمارے ہونے والے بچے کی پیدائش کا وقت نزدیک آ گیا ۔

آخر وہ دن آ ہی گیا ۔ ادھر گھر کے اندر نرسیں اور لیڈی ڈاکٹر اپنے
کام میں مصروف تھیں ۔ اور ادھر گھر کے باہر لوگ اپنی بحث میں لڑکے
اور لڑکی کی رٹ پر شدت لگائی جا رہی تھی ۔ جوں جوں بچے کی پیدائش
کا وقت نزدیک آتا گیا ۔ توں توں شرطیں لگانے والوں کی بحث بھی تیز
تر ہوتی جا رہی تھی ۔ ان لوگوں کو آپس میں الجھتا دیکھ کر آس پاس کے گلی محلہ
اور بازاروں والے لوگ بھی تماشہ دیکھنے کے لئے ہمارے محلہ والے
مکان میں اکٹھا ہونا شروع ہو گئے ۔ اور ان کی تعداد سینکڑوں تک
جا پہنچی ۔ پرانی شرطیں لگانے والوں کے جوش کو دیکھتے تماشائیوں نے بھی آپس
میں شرطیں لگانی شروع کر دیں ۔ بحث اور بھی گرم ہو گئی اور گرم ہو کر کھولنے
لگی ۔ شور شرابہ اور بھی بڑھ گیا ۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہمارے
گھر کے اندر کسی بچے کی پیدائش نہیں ہو رہی ۔ بلکہ ڈربی کی لاٹری کے ٹکٹ نمبر
نکالے جا رہے ہیں ۔

گھر کے اندر سے لیڈی ڈاکٹر بار بار یہ پیغام بھیج رہی تھی کہ شور و غل
اور بحث مباحثہ بند کر دو کیونکہ اس سے ان کے کام میں رکاوٹ ہو رہی تھی
مگر گھر کے باہر لوگوں کے درمیان جو بحث گرم ہو کر کھولنے لگی تھی ۔ اب ابلنے

شروع ہو گئی۔ پہلے پہل تو اس بحث کا دائرہ صرف جوشیلے الفاظ تک ہی محدود تھا مگر اب کہیں کہیں گالی گلوچ تک بھی نوبت آ پہنچی تھی۔ جن صاحب سے ہماری شرط لگی ہوئی تھی وہ زور سے گرج کر بولے "لڑکی ہی پیدا ہوگی!"

"ہرگز نہیں۔ لڑکا ہی ہوگا" ان کے مخالفین نے چلاتے ہوئے کہا۔

"میں پھر کہتا ہوں اور ہزار بار کہتا ہوں" ہمارے دوست نے چیختے ہوئے کہا "ان کے ہاں لڑکی ہی پیدا ہوگی۔ اگر لڑکا پیدا ہو گیا تو میں آپ سب صاحبان کے سامنے اپنی یہ بڑی بڑی مونچھیں خوشی خوشی نائی سے منڈوا دوں گا اور آپ لوگوں کے دستخط کروا کر ایک درخواست راشٹرپتی کی خدمت بھیج دوں گا جس میں یہ سفارش کی جائے گی کہ ہمارے دوست کو بے مثال بہادری (لڑکا پیدا کرنے کی) دکھلانے کے عوض بہادری کا سب سے بڑا اعزاز "پرم ویر چکر" عنایت فرمایا جاوے۔

"آمین" لڑکے کے حمایتیوں میں سے ایک چلایا۔ لیکن پھر کیا تھا۔ لڑکی کے حامیوں نے بھی جوابی نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ "ہرگز نہیں لڑکی ہی ہوگی!"

"لڑکا ہی ہوگا" لڑکے کے حامیوں کی حمیت اور بھی جوش کھاتی ہوئی بھڑکی۔

"لڑکی ہی ہوگی" مخالفین نے غراتے ہوئے کہا۔

"لڑکا ہی ہوگا" دوسری طرف والے چنگھاڑتے ہوئے بولے۔

"لڑکی زندہ باد" لڑکی والوں نے نعرہ لگایا۔

لڑکا پائندہ باد لڑکے والے جوابی نعرہ لگاتے ہوئے۔

"لڑکی زندہ باد"

"لڑکا پائندہ باد"

آخیر یہ نعرہ بازی رنگ لائی۔ جو بحث پہلے گالی گلوچ میں بدلی تھی اب ہاتھا پائی تک پہنچ گئی۔ مخالفین ڈھول دھپے سے ایک دوسرے کی خاطر تواضع کرنے لگے۔ ہم نے سوچ کر کہ کہیں ہمارا محلہ دوسرا جنگ نہ بن جائے جھٹ پولیس کو اطلاع بھجوا دی۔ تھوڑی دیر بعد پولیس کی ایک پوری گارد مع ایس۔ پی اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ صاحبان موقعہ پر پہنچ گئی لوگوں کو فوراً منتشر ہو جانے کا حکم دیا گیا جس پر ڈرپوک اشخاص تو وہاں سے کھسک گئے۔ مگر باقی ماندہ وہیں پر ڈٹے رہے اور برابر جوشیلے نعرے لگاتے رہے۔ آخر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے تنگ آ کر لاٹھی اور گیس چھوڑنے کا حکم دیا۔ جس پر منٹوں کے بعد کافی سے زیادہ لوگ تتر بتر ہو گئے۔ مگر چند ایک دھن کے پکے اپنی آنکھیں بند کئے ہوئے "لڑکے اور لڑکی" کے حق میں نعرے لگاتے رہے۔ آخر پولیس ان کو امن عامہ میں خلل ڈالنے کے الزام میں گرفتار کر کے لے گئی۔ مگر داد دینی چاہیئے۔ ان لوگوں کے ایمان کو جو پولیس کی گشتی گاڑیوں کی طرح بدستور لڑکے اور لڑکی کے نعرے لگاتے رہے +

تعارف

(اپنی قوم کے چند ایک اہم کرداروں سے)

ان سے ملیئے ...... آپ ہیں ہمارے وزیر آبادکاری شری ڈھانڈو مل جی۔ چونکہ وزیر صاحب کو اونگھنے، وعدوں کرنے اور جوڑ توڑ پارٹی بازی، ٹیکس اور حکومت کا پراپیگنڈا کرنے سے فرصت نہیں ملتی اس لئے ان کا سارا نوے فیصدی کام ان کے سیکرٹری ہی کرتے ہیں۔ دوسرے وزیروں کی طرح شری ڈھانڈو مل صاحب کا حافظہ بھی کمزور ہو گیا ہے۔ انہیں جنتا سے کئے ہوئے وعدے یاد نہیں رہتے۔ ملک کی آزادی اور الیکشن سے پہلے یہ لوگ اتنے لمبے چوڑے وعدے کرتے تھے کہ انہیں جمع کریں تو کتاب بھی

طرح ہجوم اُٹھتا تھا جیسے کسی مشاعرے میں جب ایک اچھے اشعار کو سن
کر۔ ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے یہ لوگ گدیاں سنبھالنے کے بعد ہندوستان کو
اگر جنت نہیں تو کم از کم جنت نما ضرور بنا دیں گے۔ ہر شخص کو روٹی کپڑا
اور مکان مہیا کریں گے۔ اگر کوئی شخص روٹی نہیں کھانا چاہے گا تو یہ زبردستی
اس کے منہ میں پراٹھے ٹھونس دیں گے۔ اگر کوئی جان بوجھ کر بھی ننگا رہنا
چاہے گا تو یہ پانچ سات تھان کپڑے کے لے کر اس کی طرف لپکیں گے
اور اگر کوئی شخص مکان میں گھس کر ہی دم لیں گے۔ لیکن جو کچھ ہوا اس کا ذکر کر کے
ہم خود شرمندہ نہیں ہونا چاہتے کیونکہ وزیر صاحب نے تو شرم بیچ کھائی ہے.
اگر یہ شرم پروف نہ ہوتے چیونٹی کی طرح وزارت کی شکر سے نہ چمٹے...
رہتے..

یہ ہیں روزنامہ اخبار "قبرستان" کے ایڈیٹر شری ایم - ایچ
پرانچیا۔ معمولی سے معمولی خبروں کو بڑھا چڑھا کر سنسنی خیز انداز میں پیش
کرنا ان کے بائیں ہاتھ کا کرتب ہے ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ
ہے کہ ان کا قلم کسی شخصیت یا پارٹی کی ہجو لکھتے لکھتے اچانک ہی اس کی
شان میں قصیدے الاپنا شروع کر دیتا ہے۔ آخر ان کے روپے میں
یہ آنا نا تا کیسا ہے. جانتے ہیں کیا انہیں کوئی الہام ہوتا ہے؛ جی نہیں
...... بلکہ پُراسرار روپے کی معنوی طاقت ان کی تحریر کے طوفان کا رُخ موڑ
کر دیتا ہے۔!

ان کے اداریئے پڑھ کر ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے کسی ناکام افسانہ نویس نے کوئی کہانی لکھنے کی بھونڈی سی کوشش کی ہو۔ ان کے اخبار میں صرف چند خبریں کام کی اور نئی ہوتی ہیں۔ باقی سب خبریں چھپی خبروں کے الفاظ کو ادل بدل کر ناموں اور شہروں کے مناسب ہیر پھیر کو مد نظر رکھتے ہوئے دوبارہ شائع کر دی جاتی ہیں۔ بعض اوقات تو ایک ہی خبر ایک ہی ایڈیشن میں اور ایک جیسے الفاظ میں دو مختلف صفحات پر آپ کے ذوق اخبار نویسی کی داد دیتے ہوئے نظر آتی ہے۔ چھپائی کی غلطیاں تو آپ کے اخبار کا خاصہ ہیں۔ ایک دفعہ آپ کے اخبار میں ایک نئے بیاہے جوڑے کی تصویر کے نیچے یہ الفاظ چھپے ہوئے دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ لکھا تھا مسٹر راجپال کی شادی میرٹھ کے مشہور ڈاکو جگن ناتھ کی سپتری ترلا سے ہوئی۔ یہ سوچ کر میری حیرانگی کی کوئی حد نہ رہی کہ آجکل مشہور ڈاکوؤں کی لڑکیاں بھی اپنی شادی کا فوٹو اخبار میں کس جرأت کے ساتھ چھپواتی تھیں۔ اور حیرت کی بات یہ ہے کہ انہیں ڈاکو کی بیٹی لکھوانے میں کوئی عذر نہیں۔ مگر دوسرے روز جب ایڈیٹر صاحب نے لمبی چوڑی معذرت طلب کرتے ہوئے ان الفاظ کی تصحیح شائع کی تو تمام معاملہ میری سمجھ میں آگیا۔ بات یہ ہوئی کہ آپ کے کاتب نے غلطی سے مشہور ڈاکٹر کے الفاظ کی بجائے مشہور ڈاکو لکھ دیا تھا۔ جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے۔

آپ ہیں ایگزیکیٹو انجینیئر شری پی۔ ٹی۔ یوحنا والا۔ انہیں یہ مت پوچھیے
کہ نئے بنتے پراجیکٹوں کی مختلف نہروں کو چالو کرتے وقت جب پانی چھوڑا جاتا ہے
تو جگہ بجگہ سائیفن کیوں ٹوٹ جاتے ہیں۔ کیا اس کی وجہ یہ تو نہیں ہے کہ ان کی تعمیر کے
وقت بجری اور سیمنٹ کی بجائے ریت اور مٹی کا دل کھول کر استعمال کیا جاتا ہے۔ اور
باقی ماندہ مٹی گورنمنٹ کی آنکھوں میں بھی جھونک دی جاتی ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے
تو کیا اسے آپ کی انجینیئری کے کمال کا ایک نمونہ سمجھنا چاہیے۔ اگر آپ کوئی نئی سڑک
بناتے ہیں تو ایک آدھ برسات کے بعد وہ دلدل کی شکل میں کیسے تبدیل ہو جاتی ہے
کیا اسے بھی آپ کے فن کی شعبدہ بازی سمجھا جائے؟ ....

....

انہیں یہ بھی مت پوچھیے کہ اپنی نوکری کے دوران چار پانچ سال کی
قلیل مدت میں آپ کم از کم ایک عالیشان کوٹھی کیسے بنوا لیتے ہیں حالانکہ اگر آپ اپنے
شاہی خرچ کے بعد اپنی تنخواہ سے پیسے بچاتے تو اتنے عرصہ میں کوٹھی تو کیا ایک چھپّا
ہوا کوٹھا بھی کھڑا نہیں کر سکتے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ آپ کی اپنی کوٹھی کی بنیادیں
اتنی مضبوط بنی ہیں کہ چالیس پچاس برس تو کیا اگر حب کردہ تنگل نہر کا
سارا پانی اس کی طرف چھوڑ دیا جائے تو اس کی ایک اینٹ تک نہیں ہل سکتی۔ کہاں
نہر کے سائیفن کہاں آپ کی کوٹھی کی بنیادیں۔ بھلا

اور آپ ہیں ڈاکٹر دتا مل لاٹے ایم۔ بی۔ بی۔ ایس۔ انہیں مریض آپ کو
مسیحا کی بجائے ملک الموت سمجھتے ہیں۔ بس غنیمت یہ ہے کہ آپ کا نظریہ حقیقت سے

ذہب سے بیماری مریض کے جسم کو کھا جاتی ہے۔ اور آپ ایسے ڈاکٹر ہیں کہ
جب کو اس لئے بیچارہ مریض اگر تمہاری نوازش سے جسمانی طور پر ٹھیک بھی
ہو جاتا ہے تو روحانی طور پر ہمیشہ کے لئے مریض ہی رہتا ہے۔ حضرت عیسیٰ مسیح نے فرمایا ہے
"اے خدا مجھے ہر قسم کی مصیبت سے نکال دینا لیکن امتحان کی مصیبت
میں میرے دشمن کو بھی نہ ڈالنا" - مگر آج کل کے ایک مشہور آدمی کا کہنا ہے
"میرے خدا - مجھے ہر قسم کی مصیبت میں ڈال دینا لیکن ڈاکٹروں کے چنگل میں
میرے دشمن کو بھی نہ ڈالنا"

خدا دیکھنا - وہ سامنے کون آ رہے ہیں - جی ہاں ....
وہ - بڑی بڑی مونچھوں والے موٹے صاحب. کیا کہا؟ کوئی تھانیدار معلوم
پڑتے ہیں - جی ہاں - بالکل ٹھیک - آپ کا خیال سو فیصدی درست ہے - بیشک
درست ہے - ان کا نام ہے بخشی فرنیل سنگھ - ابھی انہیں تھانیدار
بنے زیادہ عرصہ نہیں ہوا ہے لیکن تھوڑے عرصے میں ہی مشہور ہو گئے۔ آپ
جب [illegible] اور [illegible] کی قسم کے تھانیداروں کو بھی پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ جب کسی
واقعہ کی تفتیش کے سلسلہ میں کسی کے گھر جاتے ہیں تو اس کے داماد کی
طرح چائے پانی اور روٹی بوٹی سے خاطر تواضع کروانا اپنا پیدائشی حق
سمجھتے ہیں - بات بات میں گالی گلوچ روزی کا ذریعہ نکالنا تو آپ کا محکمانہ مشغلہ
ہے - رشوت تو آپ لیتے ہی نہیں البتہ "نذرانہ" ضرور قبول کر لیتے ہیں۔
چند دن ہوئے کہ محکمہ اینٹی کرپشن ڈیپارٹمنٹ کے ایک رکن نے
آپ کے خلاف رشوت ستانی کے سلسلے میں رپورٹ درج کروائی تھی -

رپورٹ ہونے کی دیر تھی کہ آپ کی خوفناک مونچھیں جو کٹکھڑی کلاس مڈیوں کی طرح ہر دم کھڑی
دس منٹ کی حالت میں تحصیل تمام معاملات کچھ بگڑ گئے بیس منٹ کا وقت ظاہر کرنے
لگ گئی تھیں اور آپ کی کلف لگی ہوئی پگڑی کا ۔۔۔۔ طرہ [illegible] ۹۰ درجے کا زاویہ
بنانے کی بجائے ۱۸۰ درجے پر آ گیا تھا۔ لیکن پتہ نہیں کہ ایک ہفتے کے اندر اندر
ہی آپ نے کون سا عمل کیا کہ آپ کے خلاف دائر کردہ رپورٹ ٹھیک ٹھیک ثبوت
نہ ملنے کے باعث واپس لے لی گئی۔ اس واقعہ کے بعد آپ پہلے سے بھی
زیادہ اکڑ کر چلتے ہیں اور آپ کی مونچھیں اسی جگہ واپس پہنچ گئی ہیں جہاں سے
وہ ایک ہفتہ پہلے چلی تھیں!

احباب میں صاحب سے جن کا تعارف کروانے لگا ہوں ان کا
نام ہے پریتم داس پونچھ۔ یہ صاحب ایک سرکاری دفتر میں کلرک لگے ہوئے ہیں لوگوں
کو چھوٹے چھوٹے کاموں کے سلسلے میں معشوق کی گلی کی طرح بار بار آپ کے دفتر
کے چکر کاٹنے پڑتے ہیں۔ وہ پہروں آپ کے کمرے کے باہر اپنے دریافت کردہ
امور کے جواب کے انتظار میں بیٹھے مکھیاں مارتے رہتے ہیں۔ مگر آپ ہیں کہ اُن کے
سوالات کا جواب دینے کی بجائے اپنے کسی رفیق کار سے اپنے پڑوس میں
رہنے والی لڑکی سے رومان کے متعلق یا کسی تھیٹر یا سینما کی فلم کی ہیروئن کے
متعلق خوش گپیاں ہانکتے رہتے ہیں۔ یا پھر قلم کو ہاتھ میں لے کر اپنے
رجسٹر کے کسی صفحے پر [illegible] اس طرح مصروف نظر
آتے ہیں جیسے کوئی بہت بڑا [illegible] آرٹ کی دنیا میں [illegible]

تی ہو - ایسے میں آپ مٹر کی کے پاس کھڑے ہوئے لوگوں کے سوالات کی طرف
ذرہ دھیان نہیں دیتے - بلکہ ان سنی کر دیتے ہیں - جب کوئی ذرا بار بار
اونچی آواز سے آپ سے کچھ دریافت کرتا ہے تو آپ جلال میں آ کر اسے ایسے
غصے سے جواب دیتے ہیں گویا کہ اس نے آپ کی سمادھی بھنگ کر دی ہو - آج کل
آپ کی بالکل ٹکٹ دے کر وزن تیلانے والی مشین کی طرح ہو چکی ہے -
جس طرح ہم اس میں اکنی ڈال کر اپنا وزن معلوم کر سکتے ہیں ٹھیک اسی طرح
آپ کی ہتھیلی میں چند سکے ڈال کر ہم اپنے کام کی بابت جان سکتے ہیں
کہ ہمارا کام کب اور کس طریقے سے ہو گا +.

اور آپ ہیں سیٹھ کھیر بھابی دھیرو بھابی کر لینے والا - آپ ایک بہت
بڑے جنرل سٹور کے اکلوتے مالک ہیں ان کے سٹور کے کئی ڈیپارٹمنٹ ہیں
سیٹھ صاحب کریم پاؤڈر اور دوائیوں سے لے کر گرم مصالحوں - ملیدی
تمل دستیاب تک ہر چیز میں ملاوٹ کرتے ہیں اگر کوئی غریب مندہ مشتاق آج
کی ملاوٹ شدہ آمیز اشیا کھا کر ہمیشہ میں مبتلا ہو کر قریب المرگ ہو جائے
اور خدا نخواستہ خودکشی کرنے کے لیے سیٹھ صاحب کے سٹور میں
زہریلے کھر کو بھی بیچا ہے کا چھٹکارا نہ ہو سکے گا - کیونکہ میں جناب کی
مہربانی سے خالص زہر ملنا بھی مشکل ہو گیا ہے - اس میں آپ کی ستم ظریفی یہ
ہے کہ ملاوٹ کے علاوہ آپ تول میں بھی چیزیں کم دیتے ہیں - کم تول لینے
سے شاید آپ کا مطلب ہے کہ اگر گاہکوں کو پوری جیب تول لی تو بیچارے کو خواہ مخواہ

زیادہ وزن اٹھانا پڑے گا کیوں نا امریکی جیب ملکی کرنسی کے ساتھ
اس کے ہاتھ فروخت شدہ اشیا کا وزن بھی ہلکا کر دیا جائے۔ سیٹھ صاحب
گاہک کی خوب سیوا کرتے پھر خدا آپ کو اس سیوا کا میوہ ضرور دے گا شاید
اس سے پہلے کوئی مجسٹریٹ ہی دے دے!

بہ مسٹر ستیہ پال آنند جی۔ ایم۔ ایل۔ اے۔ ایڈووکیٹ۔ یہ صاحب
فرماتے نہیں، بتاتے ہیں کہ آج کل وکالت کا دوسرا نام جھوٹ کیوں پڑ گیا ہے۔ لوگ یہ
کیوں کہتے ہیں کہ کوئی شخص جتنا زیادہ کمائے گا اتنا ہی جھوٹوں کا گرو گھنٹال اور جلد
سوسائٹی میں کہلانے والا ہوگا جھوٹ کو اپنی لفظی ہیرا پھیری سے سچ
ثابت کر دکھائے۔ ہائی کورٹ میں انہوں نے یہ کہہ کر اس شعبہ سے پاکدامن کہلائے
میں۔ مسٹر ستیہ پال آنند جی کا تو زبان میں ان الفاظ کی جھنک پڑ جاتی ہے۔ زمین
کی کھوپڑیوں کے سر کاٹتے اور کبھی کبھی آسمان پر لگنے والی ہوائی سپریم
کورٹ کا فیصلہ سنا کر دم لیں۔ جب ملک ستیہ سے پیارے آپ کو کہلاتا
صاحب بیں پیشی ہوگی تو کہتے ہیں موصوف کا سمن آپ کے سامنے آئیں گے
تو اس وقت آپ کی کیا حالت ہو گی۔ اب حق شناسی پر اڑے رہنے کو زوردار رد ہے
مسئلہ کرسمن کی تعمیل میں گریز نہ ہو سکے گا۔
کچھ لوگ کہتے ہیں مگر شک نہیں کہ چھوٹ ہے پر شک عزت کا دعوے ذرا
کر کے دیکھئے گا!

لیجئے اب آخر میں ہم آپ کی ملاقات ایک ہونہار طالب علم شری رمیش
سی۔ کھنہ سے کرواتے ہیں۔ رمیش صاحب کا دھیان اپنی کتابوں کی بجائے
فلموں کی طرف زیادہ رہتا ہے۔ اپنی جماعت میں پروفیسروں کے دیئے
ہوئے لیکچر تو آپ کو یاد نہیں رہتے لیکن ہر ایکٹر اور ایکٹرس کی رہائش
گاہ کا پورا پتہ معہ اُن کی تاریخ پیدائش کے زبانی یاد رہتا ہے۔ آپ کو یہ
تو پتہ نہیں رہتا کہ پانی پت کی پہلی لڑائی کون سے سن میں ہوئی اور کس نے
جیتی لیکن یہ نہیں بھولتا کہ بینا رائے کی پہلی فلم "کالی گھٹا" تھی اور اُسے
کشور ساہو نے ڈائرکٹ کیا تھا۔ آپ کو یہ تو بھول جاتا ہے کہ مغلوں کے زمانہ
میں ہندوستانیوں کا لباس کیا ہوتا تھا لیکن یہ یاد رہتا ہے کہ دلیپ کمار
نے فلم "شبنم" میں ململ کی بُشرٹ پہنی ہوئی تھی اور راج کپور نے
فلم "آوارہ" میں اس طرح کی پتلون پہنی ہوئی تھی۔ آپ کو یہ خیال نہیں رہتا کہ
پہلی پانچسالہ یوجنا پر کتنا روپیہ خرچ ہوا ہے۔ لیکن یہ خیال ضرور رہتا ہے
کہ مدھوبالا نے مغلِ اعظم میں کام کرنے کا ڈیڑھ لاکھ روپیہ لیا تھا۔ رمیش
صاحب۔ کیا آپ کو گھر والے پڑھنے کے لئے روپیہ دیتے ہیں یا سنیما۔
سگریٹ اور میک اپ کے لئے۔ میک اپ آپ لڑکیوں سے بڑھ چڑھ کر
کرتے ہیں۔ بلکہ فیشن میں آپ لڑکیوں کے ڈیزائن والے کپڑے پہنتے ہیں۔ اس لئے
بعض دفعہ تو دور سے دیکھنے پر یہ پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے کہ آپ لڑکے
ہیں یا لڑکی؟

ہماری فلمیں

ہندوستانی فلمیں دیکھ دیکھ کر بیزار سا ہو گیا ہوں۔ کچھ دنوں سے یہ حال ہے کہ جب روزمرہ کے کاموں سے تھک کر میں اپنی اکتاہٹ دور کرنے کے لئے پکچر دیکھنے جاتا ہوں تو وہاں سے تفریح حاصل کرنے کی بجائے الٹا ڈھائیں مار کر روتا ہوا باہر نکلتا ہوں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ فلم کے کسی دردناک منظر کو دیکھ کر میرا یہ حال ہوتا ہے لیکن انہیں کیا معلوم کہ میری یہ حالت کسی المیہ منظر کو دیکھنے کی بجائے ہندوستانی پروڈیوسروں کی عقل کا ماتم کرنے کی وجہ سے ہوتی ہے۔ ہماری فلمیں عجیب ہیں۔ اگر کسی مزاحیہ فلم کو دیکھنے کے

مگر جب بھی تو سنیما ہال سے روتے ہوئے باہر نکلتے ہیں اور اگر کوئی المیہ فلم دیکھتے ہیں تو ہماری
ہنستے ہوئے بیڑیاں اور پسلیاں تک پھڑک اٹھتی ہیں۔ کامیڈی میں تو مسخرے اداکاروں کی
فضول اُچھل کود اور طفلانہ حرکات کو دیکھ کر ہنسی تماشہ رونا آجاتا ہے اور ٹریجیڈی دیکھ
کر بیچارے ہیرو کی بے سروپا چیخ و پکار موقع بے موقع فریاد اور آہ و زاری ہمیں خواہ
مخواہ قہقہے لگانے پر مجبور کر دیتی ہے۔ صرف ایک ہیرو اور ہیروئین کو چھوڑ
کر باقی سب اداکار چہرے اور حرکات سے جذبات کی عکاسی اتنے بھدے
اور مصنوعی انداز سے کرتے ہیں کہ ہمارے دل میں اداکاری کی تعریف کے بجائے
اُلٹی نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری فلمیں تفریح تو کر
دیتی ہیں اور وقت زیادہ الٹی ہی صورت حال کو مدِنظر رکھ کر میں اکثر اوقات
فیصلہ کرتا ہوں کہ ہندوستانی فلموں کا مکمل بائیکاٹ کروں گا چاہے کوئی کچھ
گھسیٹ کر بھی سنیما ہال میں لے جانے کی کوشش کرے تو بھی نہ جاؤں گا۔ مگر
میرا یہ فیصلہ اکثر ہندوستانی وزیروں کے وعدوں کی طرح ہمیشہ ادھورا ہی رہ جاتا
ہے لوگ تو کہتے ہیں کہ دھوبی کا کتا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا مگر میں یہ کہتا ہوں کہ فلموں
کا کتا نہ گھر کا نہ سنیما کا۔ بیچارہ فلموں کا شوقین گھر پر بھی نہیں رہ سکتا اور وہ
سنیما بھی نہیں جا سکتا۔ کیونکہ اچھی فلموں کا خوفناک قحط ہے اچھی فلمیں تو ہمارے ملک
میں اس طرح غائب ہیں جیسے محکمہ پولیس میں ایماندار اور قابلِ قدر فلمیں
موجودہ دور میں ہندوستان کی سطح زمین پر کہیں دکھائی نہیں دیتیں ہاں اگر
جگہ دنیا کی تمام کو پرانے فلم گھومتے تک لی جائیں تو بہ بنیں جیسے
پچاس سال پہلے کی فلمیں دیکھی تو ہمیں دیکھنا ہو نہ مگر ان میں صرف دو چار ہی قابلِ ذکر

ہوتی ہیں۔ جوں جوں ہمارے فلمساز اپنی فلموں پر زیادہ سے زیادہ روپیہ
صرف کر رہے ہیں توں توں ان کا معیار (اگر آپ کی نظر میں کوئی ہو!) اسی تیزی
سے گر رہا ہے جیسے پہاڑی مقامات پر برف باری کے بعد ٹمپریچر۔

فلمی نقادوں کے خیال کے مطابق اگر وہ غلط نہیں کرتے تو
کسی فلم کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ اس کی کہانی متوازن اور دل میں اتر جانے
والی ہو، ہدایت کار ہی ڈائیلاگ ناظرات کو ابھارنے میں مدد دے تاکہ جب لطیف
جذبات کا اظہار الفاظ کے ذریعہ ٹھیک طرح نہ کیا جا سکے انہیں دلنشیں حرکات
اور حسن غیر اشارہ (ٹیکنیکل TOUCHES) کے ذریعے عیاں کیا جائے اس کے بعد موسیقی
ایسی ہونی چاہیے کہ اگر ایک اندھا شخص بھی فلم دیکھنے جائے تو پس منظر کی موسیقی
اور مکالموں کو سن کر ہی فلم کی کہانی کو سمجھ لے۔ فوٹوگرافی ایسی ہونی چاہیے جو مختلف
زاویوں سے فلم کے تمام کرداروں کے لطیف ترین جذبات اور احساسات
کے اتار چڑھاؤ کو ان کے چہرے اور جسم کے دیگر اعضا کی حرکات کی صورت
عکاسی کر کے واضح انداز میں ہمارے سامنے پیش کر سکے۔ لیکن ہوتا یہ ہے
کہ ہماری فلمیں ان سب چیزوں کو چھوڑ کر باقی ہر لحاظ سے مکمل ہوتی ہیں!

کہانی کو تو ہمارے ذہین فلمساز شاید بالکل ہی فضول چیز سمجھتے ہیں اور ایک گھسا
پٹا محبت کی فرسودہ کہانیوں کو ہوبہو پیش کر کے ہر ذوق لطیف کی کند چھری
سے چیر پھاڑ کرتے رہتے ہیں۔ وہ محبت کی ازلی مثلث یعنی ایک لڑکا اور دو
لڑکیاں یا ایک لڑکی اور دو لڑکے برابر بار بار دہرا کر ہی سمجھ لیتے ہیں کہ جس میں
چرانے دینے تک مرکاش ہمارے فلمساز محبت کی اس ازلی مثلث کو

پیش کرنے کی بجائے کچھ نئی چیزیں ہمارے سامنے لائیں۔ تخیل کی کوئی تو ہمیں
دریافت کریں وقت کے نئے نئے منزلوں سے روشناس کرائیں اور ہمیں
ہماری زندگی کے نئے نئے پہلوؤں کو اجاگر کریں۔ اگر وہ کچھ درج نہیں کر سکتے
تو ایک لڑکے اور دس لڑکیوں کے درمیان یا ایک لڑکی اور اس کے دو نوجوان
عاشقوں کے درمیان محبت جیسی کوئی کہانی پیش کر کے اس محبت
کی ازلی شدت سے تو نجات دلائیں۔

اب لیجئے ہدایت کاری کو۔ نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا
ہے کہ ہمارے تنقیدی ہدایت کاروں کو یہ بھی معلوم نہیں کہ ہدایت
کاری ہے کس چڑیا کا نام۔ ثبوت کے طور پر سینکڑوں ایسی فلمیں پیش
کی جا سکتی ہیں جن میں ہمارے نام نہاد ہدایت کاروں نے ذہنی دیوالیہ پن
کا عریاں ثبوت دے رکھے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک فلم میں دیوالی
کی رات کو پورا چاند نہایت ہی آب و تاب سے چمکتے ہوئے دکھایا گیا
ایک اور فلم جو کہ مہابھارت کے زمانے سے تعلق رکھتی ہے میں مستقبل کے
ایک منظر میں ٹیلیفون کی تاروں کا کھمبا بھی دکھا دیا گیا ہے۔ میرے خیال
میں دوسری فلم کے ذہین ڈائرکٹر نے ٹیلیفون کے کھمبے کو دکھلانے
سے اشارہ یہ کیا کہ شاید شری رام چندر جی ٹیلیفون پر باتیں کیا
کرتے تھے۔ اسی طرح دو ڈھائی ہزار برس پہلے کے زمانے کی ترجمانی
کرنے والی ایک اور فلم میں ہیرو کی کلائی پر اس کے نام کے پہلے حروف
انگریزی الفاظ میں کھدے ہوئے دیکھے جا سکتے تھے۔ اس سے ظاہر

ہوتا ہے کہ انگریز اسی زمانے میں ہندوستان آ چکے تھے۔ یہ تو ہمارے
عالم فاضل ہندوستانی ڈائرکٹروں کی بصیرت افروز اور کراماتی ہدایت
کاری کی چند گھٹیا مثالیں ہیں۔ اگر ان کے تمام کرشموں کی پوری فہرست
بنائی ہو تو شاید اس کی لمبائی کئی میل ہو جائے۔

جو چاہے انکا جس کرشمہ سازی کرے۔ دھارمک اور تاریخی فلموں
میں تو اصلی واقعات کو اس طرح توڑ مروڑ کر پیش کیا جاتا ہے کہ اگر دیوتا لوگ
اور مشہور تاریخی ہستیاں ان فلموں میں اپنے کارناموں کو
دیکھ سکیں تو جھٹ مار مار کر ہدایت کاروں اور فلم سازوں کا سر گنجا کر
دیں۔

اب سنیئے ذرا ہندوستانی فلموں کی موسیقی کو۔ یہ
کہنے کی تو ضرورت ہی نہیں کہ آج کل ہر ایرا غیرا نتھو خیرا جو کر سکے۔ غلط
یا ٹھیک طریقے سے بجا سکتا ہے اپنے آپ کو میوزک ڈائرکٹر
سے کم نہیں سمجھتا۔ اس وجہ سے ہر نئی فلم میں بھانت بھانت
کی موسیقی سننے میں آتی ہے۔ اگر زمین پر سے ایک اینٹ اٹھاؤ
تو اس کے نیچے سے کم از کم چار پانچ تان سین اللہ اللہ کرتے
بچو بانوے پھدکتے ہوئے باہر نکلتے آئیں گے۔ فلم میں گانے
تو ہوتے تھے .... کرداروں کے
جذبات کی شدت کی ترجمانی اور کہانی کے تاثرات کو ابھارنے
کے لئے تاکہ اس کی رفتار میں توازن اور ہم آہنگی قائم رہ سکے

مگر ہمارے میوزک ڈائرکٹر اور فلمساز گانوں کو موقع بے
موقع اس طرح کہانی کے گلے تھوپ دیتے ہیں کہ بیچاری سو
جگہ جگہ ٹھوکریں کھاتی قلابازیاں کھاتی ہوئی آخر میں پاروں
شانے چت ہو جاتی ہے۔ اور ساری فلم کا جنازہ بڑی
دھوم دھام سے نکلوا دیتی ہے۔ ہر فلم میں گانا ہیرو اور
ہیروئن کا پیدائشی حق ہے اور انہیں اس جابرانہ حق سے
دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی طاقت بھی محروم نہیں کر سکتی۔
اٹھتے بیٹھتے۔ کھاتے پیتے۔ سوتے۔ جاگتے۔ روتے
ہنستے اور ناچتے کودتے یعنی ہر وقت آپ انہیں گاتے
ہوئے دیکھ سکتے ہیں۔

بعض اوقات تو وہ بہت غلط موقعوں پر گاتے ہیں۔
مگر قسم خدا کی جی میں آتا ہے کہ فوراً پردہ سکرین
پر پہنچ کر ان کے منہ پہ دو چار زناٹے دار تھپڑ رسید
کرے تاکہ انہیں موقع کی نزاکت کا احساس تو ہو جائے
میرا ان سب باتوں کو لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ گانے
ہماری فلموں میں ضرور ہونے چاہئیں لیکن شرط یہ ہے
کہ ان کا کہانی کے ماحول اور مقصد سے بنیادی تعلق ہونا
چاہیئے تاکہ وہ اس میں جان ڈال سکیں۔ اس
میں مسلسل عمل ـ ڈرامیٹک اور طوفان

اور دنیا کی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔

خصوصاً فلم شازی کا گانا "دیکھو گجر کہا گیا ہے

سمجھے گزرتا جائے" محمل کا ۔ گئے گا اسنے والا "ٹیکسی ڈرائیور

کا" اے میری زندگی" "پھر صبح ہوگی" "بس" "منا بیج کبھی تو آئے گی!"

طوفان اور دیا کا" "یہ کہانی ہے دیئے اور طوفان کی" وغیرہ

گانے اسوا سلیقے کی روشن مثالیں ہیں۔

آ جیسے آپ ذرا کیمرہ مین کی مزاج پرسی کیجیے

تو یہ رہے آپ ۔ عکاس ۔ دیکھیے کتنے دلکش منظر کا

فوٹو لینے کے لیے کتنی ڈھٹائی سے کیمرہ کو نزدیک لے

آیا ہے کیا اب یہ حسین منظر منظر ہی رہ جائے

گا ؟

...... ہرگز نہیں ۔ یہ تو یقیناً خبر بن کر رہ جائے

اور دیکھیے کتنا جذباتی اور دردناک لمحہ ہے ۔ ایک

بوڑھی ماں کو خبر مل رہی ہے کہ اس کا اکلوتا بیٹا جنگ میں

مارا گیا ۔ اب ہمارے کیمرہ مین صاحب بجائے اس

کے کہ اپنا کیمرہ نزدیک لے جا کر اس خبر کے دردناک

تاثرات کو بوڑھی ماں کی درد و غم کی شدت سے

لبریز نمناک آنکھوں اور لرزتے ہوئے پپڑی زدہ ہونٹوں

سے دکھائیں تھوڑی دور ہی کھڑے رہ کر بوڑھی ماں کو صبر دلاتے

سامنے زمین پر گرنے لگے تھے۔ یقیناً بہت ہی غیر موثر منظر کو
رخصیل لیتے ہیں۔ سٹ نئے کلیو میں صاحب کو دل کا دورہ
پڑتا ہے۔ اسی لئے وہ بوڑھی ماں کی غمناک آنکھوں اور
لرزتے ہونٹوں کے بدنشور سے تاثرات کو فلمانے کے لئے
اس کے نزدیک نہ جا سکے تاکہ اس کی یہ دردناک اور نازک
حالت دیکھ کر کہیں ان کا اپنا دل نہ ہل جائے۔ اجی
چاہتا ہے کہ ایسے کیمرہ مین کو دھکے مار مار کر سٹوڈیو
سے باہر نکال دیں۔ اپنی پہلی فرصت میں اسے جو ہو
سکے کنارے لے جا کر سمندر میں اس کا جیل پروا کر
دیویں تاکہ آئندہ اس قماش کے لوگ اپنے تخیل
کی گندگی سے ایسے دلسوز اور رقت انگیز
مناظر کو ذبح نہ کر سکیں۔

ہماری فلموں میں ناچ بھی اتنے ہی ضروری
ہیں جتنا کہ گانے۔ ہر فلم میں عموماً ایک درجن گانے
اور آدھی درجن ناچ ہوتے ہیں۔ یہ علیحدہ بات ہے
کہ ہمارے ڈانس ڈائرکٹروں کا ناچ سے متعلق کا نظریہ
کلاسیکل ناچوں کے ماہرین کے نظریہ سے بالکل الگ ہے
ان کے خیال اسٹرادیہ میں ایکٹرسوں کو بے حیائی سے
کولہے مٹکا کر جسم کو ہلانے، آنکھوں کو مخرش انداز میں مٹکانے

حیا سوز ادائیں دکھلانے اور سینے پنجم آچھوں کر دینا دوسرا نام مزاج
سے ۔ کبھی کبھی تو ان کے ناچ تو بہت سکول کے بچوں کی تمثیل زیادہ
والی سمجھانے والی ہوتی ہے !

اب آپ ہی کہیے کہ ہم ہندوستانی فلموں کو اچھا کیوں
تو اس لحاظ سے اگر ہندوستانی فلمسازوں کو ضرور ہی اپنی کسی خوبی
کا اعتراف کروانا چاہتے ہیں ۔ تو وہ صرف یہ ہے کہ غیر ملکی فلموں
کی تکنیک اور کہانیاں چرانے میں انہیں کمال حاصل ہے !

اس کتاب کے تمام کردار مقامات اور ادارے فرضی ہیں۔ ان کا کسی شخص۔ واقعات یا ادارے سے کوئی تعلق نہیں۔ کسی فرد۔ مقام یا ادارے سے مطابقت قطعی اتفاقیہ ہے۔ اس کے لئے مصنف یا پبلشرز پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی